# اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اِسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

معمولی حالات میں، جب کہ زندگی کا دریا سکون کے ساتھ بہہ رہا ہو، انسان ایک طرح کا اطمینان محسوس کرتا ہے۔ کیوں کہ اوپر کی صاف شفاف سطح ایک پردہ بن جاتی ہے، جس کے نیچے تہ میں بیٹھی ہوئی گندگیاں اور غلاظتیں چھپی رہتی ہیں اور پردے کے اوپر صفائی آدمی کو اس بات کا تجسّس کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس ہونے دیتی ہے کہ تہ میں کیا چھپا ہوا ہے اور کیوں چھپا ہوا ہے۔ لیکن جب اس دریا میں طوفان برپا ہوتا ہے اور نیچے کی چھپی ہوئی ساری گندگیاں اور غلاظتیں اُبھر کر برسرِ عام سطحِ دریا پر بہنے لگتی ہیں اس وقت اندھوں کے سوا ہر وہ شخص، جس کے دِیدوں میں کچھ بھی بینائی کا نور باقی ہو، ہر اشتباہ کے بغیر صاف صاف دیکھ لیتا ہے کہ زندگی کا دریا کیا کچھ اپنے اندر لیے ہوئے چل رہا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب عام انسانوں میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہوسکتا ہے کہ اُس منبع کا سراغ لگائیں جہاں سے دریائے زندگی میں یہ گندگیاں آرہی ہیں، اور اُس تدبیر کی جستجو کریں جس سے اِس دریا کو پاک کیا اور رکھا جاسکے۔ فی الواقع اگر ایسے وقت میں بھی لوگوں کے اندر اس ضرورت کا احساس بیدار نہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ نوعِ انسانی اپنی غفلت کے نشے میں مدہوش ہوکر سود وزیاں سے بالکل ہی بے فکر ہوچکی ہے۔

یہ زمانہ جس سے ہم آج کل گزر رہے ہیں اِنھی غیر معمولی حالات کا زمانہ ہے۔ زندگی کا دریا اِس وقت اپنی طغیانی پر ہے۔ ملک ملک اور قوم قوم کے درمیان سخت کشمکش برپا ہے اور یہ کشمکش اتنی گہرائی تک اُتری ہوئی ہے کہ بڑے بڑے مجموعوں سے گزر کر فرد فرد تک کو نزاع کے میدان میں کھینچ لائی ہے۔ اِس طرح عالمِ انسانی کے بیشتر حصہ نے اپنے وہ تمام اخلاقی اوصاف اُگل کر منظرِ عام پر رکھ دیئے ہیں جنھیں وہ مدّتوں سے اندر ہی اندر پرورش کررہا تھا۔ اب ہم اُن گندگیوں کو علانیہ سطحِ زندگی پر دیکھ رہے

ہیں، جن کو تلاش کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تعمق کی ضرورت تھی۔ اب صرف ایک مادرزاد اندھا ہی اس غلط فہمی میں مبتلا رہ سکتا ہے کہ ''بیمار کا حال اچھا ہے۔'' اور صرف وہی لوگ بیماری کی تشخیص اور علاج کی فکر سے غافل رہ سکتے ہیں جو حیوانات کی طرح اخلاقی حِس سے بالکل خالی ہیں یا جن کے اخلاقی احساسات پر فالج گر گیا ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ پوری پوری قومیں بہت بڑے پیمانے پر اُن بدترین اخلاقی صفات کا مظاہرہ کر رہی ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کے ضمیر نے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بے انصافی، بے رحمی، ظلم وستم، جھوٹ، دغا، فریب، مکر، بدعہدی، خیانت، بے شرمی، نفس پرستی، استحصال بالجبر اور ایسے ہی دوسرے جرائم محض انفرادی جرائم نہیں رہے ہیں بلکہ قومی اخلاق کی حیثیت سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی قومیں اجتماعی حیثیت سے وہ سب کچھ کر رہی ہیں جس کا ارتکاب کرنے والے افراد ابھی تک ان کے ہاں جیلوں میں ٹھونسے جاتے ہیں۔ ہر قوم نے چھانٹ چھانٹ کر اپنے بڑے سے بڑے مجرموں کو اپنا لیڈر اور سربراہ کار بنایا ہے اور ان کی قیادت میں بدمعاشی کی کوئی مکروہ سے مکروہ قسم ایسی نہیں رہ گئی ہے، جس کا وہ کھلم کھلا نہایت بے حیائی کے ساتھ وسیع پیمانے پر ارتکاب نہ کر رہی ہوں۔ ہر قوم دوسری قوم کے خلاف جھوٹ تصنیف کر کر کے علانیہ نشر کر رہی ہے اور ریڈیو کے ذریعہ سے اِن جھوٹوں نے فضائے اثیر تک کو گندہ کر دیا ہے۔ پورے پورے ملکوں اور براعظموں کی آبادیاں لٹیروں اور ڈاکوؤں میں تبدیل ہو گئی ہیں اور ہر ڈاکو عین اس وقت جب کہ وہ خود ڈاکہ مار رہا ہوتا ہے نہایت بے شرمی کے ساتھ اپنے مخالف ڈاکو کی اُن ساری گناہ گاریوں کا شکوہ کرتا ہے جن سے داغ دار ہونے میں اس کا اپنا دامن بھی اپنے حریف سے کچھ کم سیاہ نہیں ہوتا۔ انصاف کے معنی ان ظالموں کے نزدیک صرف اپنی قوم کے ساتھ انصاف کے رہ گئے ہیں۔ حق جو کچھ ہے اِن کے لیے ہے۔ دوسروں کے حقوق پر دست درازی اِن کے اخلاقی قانون میں جائز بلکہ کارِ ثواب ہے۔ قریب قریب تمام قوموں کا حال یہ ہو چکا ہے کہ ان کے ہاں لینے کے پیمانے اور ہیں اور دینے کے اور۔ جتنے معیار وہ اپنے مفاد کے لیے قائم کرتی ہیں، دوسروں کا مفاد سامنے آتے ہی وہ سب معیار بدل جاتے ہیں، اور جن معیاروں کا وہ دوسروں سے مطالبہ کرتی ہیں ان کی پابندی خود کرنا حرام سمجھتی ہیں۔ بدعہدی کا مرض اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اب ایک قوم کو دوسری قوم پر کوئی اعتماد باقی نہیں رہا۔ بڑی بڑی قوموں کے نمائندے نہایت مہذب صورتیں لیے ہوئے جب بین الاقوامی معاہدوں پر دستخط کر رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کے دلوں میں یہ خبیث نیت چھپی ہوئی ہوتی

ہے کہ پہلا موقع ملتے ہی اس مقدس بکرے کو قومی مفاد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائیں گے۔ اور جب ایک قوم کا صدر یا وزیر اعظم اس قربانی کے لیے چھری تیز کرتا ہے تو پوری قوم میں سے ایک آواز بھی اس بداخلاقی کے خلاف نہیں اٹھتی، بلکہ ملک کی پوری آبادی اس جرم میں شریک ہو جاتی ہے۔ مکاری کا حال یہ ہے کہ بڑے بڑے پاکیزہ اخلاقی اصولوں کی گفتگو کی جاتی ہے صرف اس لیے کہ دنیا کو بے وقوف بنا کر اپنے مفاد کی خدمت اس سے لی جائے اور سادہ لوح انسانوں کو یقین دلایا جائے کہ تم سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ جو ہم کر رہے ہیں یہ کچھ اپنے لیے نہیں ہے بلکہ ہم بے غرض، نیکوں کے نیک لوگ یہ ساری تکلیفیں محض انسانیت کی بھلائی کے لیے برداشت کر رہے ہیں۔ سنگ دلی و بے رحمی اِس مرتبۂ کمال پر پہنچی ہے کہ ایک ملک جب دوسرے ملک پر حملہ آور ہوتا ہے تو اس کی آبادی کو روندنے اور کچلنے میں محض اسٹیم رولر کی سی بے حسی ہی اس سے ظاہر نہیں ہوتی بلکہ وہ نہایت مزے لے لے کر دنیا کو اپنے ان کارناموں کی اطلاع دیتا ہے، گویا اسے معلوم ہے کہ اب دنیا انسانوں سے نہیں بلکہ صرف بھیڑیوں سے آباد ہے۔ خود غرضانہ شقاوت اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو اپنے مفاد کے لیے مسخر کرنے کے بعد صرف یہی نہیں کہ بے دردی کے ساتھ اسے لوٹتی کھسوٹتی ہے بلکہ نہایت منظم طریقہ سے پیہم کوشش کرتی رہتی ہے کہ انسانیت کے تمام شریفانہ خصائل سے اُس کو خالی کردے اور وہ تمام کمینہ اوصاف اس کے اندر پرورش کرے جنہیں وہ خود نہایت گھناؤنا سمجھتی ہے۔

یہ چند نمایاں ترین اخلاقی خرابیاں میں نے محض نمونے کے طور پر بیان کی ہیں۔ ورنہ تفصیل کے ساتھ اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پوری انسانیت کا جسم اخلاقی حیثیت سے سڑ گیا ہے۔ پہلے قحبہ خانے اور قمار بازی کے اڈے اخلاقی پستی کے سب سے بڑے پھوڑے سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اب تو ہم جدھر دیکھتے ہیں انسانی تمدن پورا کا پورا ہی ایک پھوڑا نظر آتا ہے۔ قوموں کی پارلیمنٹیں اور اسمبلیاں، حکومتوں کے سکریٹریٹ اور وزارت خانے، عدالتوں کے ایوان اور وکالت خانے، پریس اور نشر گاہیں، یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے، بینک اور صنعتی و تجارتی کاروبار کے مجامع، سب کے سب پھوڑے ہی پھوڑے ہیں جو کسی تیز نشتر کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ علم جو انسانیت کا عزیز ترین جوہر ہے آج اُس کا ہر شعبہ انسانیت کی تباہی کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ طاقت اور زندگی کے تمام وسائل جو قدرت نے انسان کے لیے مہیا کیے تھے فساد اور خرابی کے کاموں میں ضائع کیے جا رہے ہیں۔ اور وہ صفات بھی، جو انسان کی بہترین اخلاقی صفات سمجھی جاتی تھیں، مثلاً شجاعت، ایثار،

قربانی، فیاضی، صبر، تحمّل، اولوالعزمی، بلند حوصلگی وغیرہ، آج ان کو بھی چند بڑی اور بنیادی بداخلاقیوں کا خادم بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اجتماعی خرابیاں اُس وقت اُبھر کر نمایاں ہوتی ہیں جب انفرادی خرابیاں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہوتی ہیں آپ اس بات کا تصوّر نہیں کر سکتے کہ کسی سوسائٹی کے بیشتر افراد نیک کردار ہوں اور وہ سوسائٹی بہ حیثیتِ مجموعی بدکرداری کا مظاہرہ کرے۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ نیک کردار لوگ اپنی قیادت اور نمائندگی اور سربراہ کاری بدکردار لوگوں کے ہاتھ میں دے دیں اور اس بات پر راضی ہو جائیں کہ ان کے قومی اور ملکی اور بین الاقوامی معاملات کو غیر اخلاقی اصولوں پر چلایا جائے۔ اس لیے جب وسیع پیمانے پر دنیا کی قومیں اِن گھناؤنے اور رذیل اخلاقی اوصاف کا اظہار اپنے اجتماعی اداروں کے ذریعہ سے کر رہی ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آج نوعِ انسانی اپنی تمام علمی و تمدّنی ترقیوں کے باوجود ایک شدید اخلاقی تنزل میں مبتلا ہے اور اس کے بیشتر افراد اس وبا سے متاثر ہو چکے ہیں۔ یہ حالت اگر یونہی ترقی کرتی رہی تو وہ وقت دُور نہیں جب انسانیت کسی بہت بڑی تباہی سے دوچار ہو گی اور ایک طویل عہدِ ظلمت اس پر چھا جائے گا۔

اب اگر ہم آنکھیں بند کر کے تباہی کے گڑھے کی طرف سرپٹ جانا نہیں چاہتے تو ہمیں کھوج لگانا چاہیے کہ اس خرابی کا سرچشمہ کہاں ہے جہاں سے یہ طوفان کی طرح اُمڈی چلی آ رہی ہے۔ چوں کہ یہ اخلاقی خرابی ہے لہٰذا لامحالہ ہمیں اس کا سُراغ اُن اخلاقی تصوّرات ہی میں ملے گا جو اس وقت دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا کے اخلاقی تصوّرات کیا ہیں؟ اس سوال کی جب ہم تحقیق کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اصولاً یہ تمام تصوّرات دو بڑی قسموں پر منقسم ہیں:

ایک قسم کے تصوّرات وہ جو خدا اور حیات بعد موت کے عقیدے پر مبنی ہیں۔

دوسری قسم کے تصوّرات وہ جو ان عقیدوں سے الگ ہٹ کر کسی دوسری بنیاد پر قائم ہوئے ہیں۔

آیئے اب ہم ان دونوں قسم کے تصوّرات کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ دنیا میں اس وقت یہ کس صورت میں پائے جاتے ہیں اور ان کے نتائج کیا ہیں۔

خدا اور حیات بعد موت کے عقیدے پر جتنے اخلاقی تصوّرات قائم ہوتے ہیں ان کی صورت کا تمام تر انحصار اُس عقیدے کی نوعیت پر ہوتا ہے جو خدا اور حیات بعد موت کے متعلق لوگوں میں پایا جاتا ہو۔

لٰہذا ہمیں دیکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت خدا کو کس شکل میں مان رہی ہے اور دوسری زندگی کے متعلق اس کے عام تخیلات کیا ہیں؟

خدا کو ماننے والے بیشتر انسان اس وقت شرک میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے اپنے زعم میں خدائی کے اکثر اختیارات، جن کا تعلق ان کی اپنی زندگی سے ہے، دوسری ہستیوں پر تقسیم کر دیئے ہیں اور اُن ہستیوں کا خیالی نقشہ اپنی خواہشات کے مطابق ایسا بنا لیا ہے کہ وہ اپنے اِن خدایانہ اختیارات کو ٹھیک اُسی طرح استعمال کرتی ہیں جس طرح یہ چاہتے ہیں کہ وہ استعمال کریں۔ یہ گناہ کرتے ہیں، وہ بخشوا لیتی ہیں۔ یہ فرائض سے غافل اور حقوق سے بے پروا ہو کر بے مہار جانور کی طرح حرام وحلال کی تمیز کے بغیر دنیا کی کھیتی کو چرتے پھرتے ہیں اور وہ کچھ نذر و نیاز کے عوض اِن کی نجات کی ضمانت لے لیتی ہیں۔ یہ چوری بھی کرنے جاتے ہیں تو اُن کی عنایت سے تھانہ دار سوتا رہ جاتا ہے۔ اِن کے اور اُن کے درمیان یہ سودا طے ہو گیا ہے کہ یہ اُن کی طرف سے عقیدہ اچھا رکھیں اور نذر پیش کرتے رہیں، اور اس کے جواب میں وہ اِن کے سب کام، جو کچھ بھی یہ کرنا چاہیں، بناتی رہیں گی اور مرنے کے بعد جب خدا انھیں پکڑنا چاہے گا تو وہ بیچ میں حائل ہو کر کہہ دیں گی کہ یہ ہمارے دامن کے سایہ میں ہیں، ان سے کچھ نہ کہا جائے۔ بلکہ بعض جگہ تو اِس پکڑ دھکڑ کی نوبت ہی نہ آئے گی، کیوں کہ اِن کے گناہوں کا کفارہ پہلے ہی کوئی ادا کر چکا ہے۔ اِن مشرکانہ عقاید نے زندگی بعد موت کے عقیدے کو بھی بے معنی کر دیا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ساری اخلاقی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں جو مذہب نے تعمیر کی تھیں۔ مذہبی اخلاقیات کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں، اور زبانوں پر ان کا ذکر بھی احترام کے ساتھ آتا ہے، مگر عملاً ان کی پابندی سے بچنے کے لیے شرک نے فرار کی بے شمار راہیں فراہم کر دی ہیں اور کچھ اِس شان سے فراہم کی ہیں کہ جس راہ سے بھی یہ چاہیں بھاگیں بہ ہر حال انھیں اطمینان ہے کہ آخر کار پہنچیں گے نجات ہی کی منزل پر۔

شرک سے قطع نظر کر کے جہاں خدا پرستی اور عقیدہ آخرت کچھ بہتر صورت میں موجود ہے، وہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے مطالبات سکڑ کر انسانی زندگی کے ایک بہت چھوٹے سے دائرے میں محدود ہو گئے ہیں۔ چند اعمال، چند رسوم، اور چند پابندیاں ہیں جن کا محدود انفرادی و معاشرتی زندگی میں خدا اِن سے مطالبہ کرتا ہے اور انھی کے معاوضے میں اُس نے ایک بہت بڑی جنت اِن کے لیے مہیا کر رکھی ہے۔ اگر یہ اُن مطالبوں کو پورا کر دیں تو پھر کوئی چیز خدا کی طرف سے اِن کے کرنے کی نہیں رہ جاتی۔ اس کے بعد یہ آزاد ہیں کہ اپنی زندگی کے معاملات جس طرح چاہیں چلائیں۔ اور اگر اُن خدائی

مطالبوں میں بھی کوتاہی رہ جائے تو اس کی رحمت اور نکتہ نوازی پر بھروسا ہے کہ وہ گناہوں کے پشتارے سے اِن سے جنت کے دروازے پر رکھوالے گا اور اندر جانے کے لیے اعزازی ٹکٹ عنایت فرمادے گا۔ اس تنگ مذہبی تصوّر نے اوّل تو زندگی کے معاملات پر مذہبی اخلاقیات کے انطباق کو بہت محدود کر دیا ہے، جس کی وجہ سے زندگی کے تمام بڑے بڑے شعبے ہر اُس اخلاقی رہ نمائی اور بندش سے آزاد ہو گئے ہیں جو مذہب سے حاصل ہو سکتی تھی، دوسرے اس تنگ دائرے میں بھی اخلاق کی گرفت سے بچ نکلنے کے لیے ایک راستہ یہاں کھلا ہوا ہے جس سے فائدہ اٹھانے میں کم ہی لوگ سستی دِکھاتے ہیں۔

ان سب سے بہتر حالت جن مذہبی طبقوں کی ہے، جو شرک سے بھی پاک ہیں، سچائی کے ساتھ خدا کو بھی مانتے ہیں، اور آخرت کے متعلق بھی کسی جھوٹے بھروسے پر تکیہ نہیں کر بیٹھے ہیں، ان کے اندر اخلاق کی پاکیزگی تو بے شک پائی جاتی ہے، اور بہترین سیرت و کردار کے لوگ ان میں مل جاتے ہیں، لیکن ان کو بالعموم مذہب و روحانیت کے محدود تصوّر نے خراب کر رکھا ہے۔ وہ دنیا اور اس کے مسائلِ زندگی سے بڑی حد تک بے تعلق ہو کر یا تو چند مخصوص کاموں کو، جنھیں مذہبی کام سمجھا جاتا ہے، لے بیٹھتے ہیں، یا اپنے نفس کو مانجھ مانجھ کر صاف کرتے ہیں تاکہ وہ اِس دنیا ہی میں عالمِ غیب کی آوازیں سننے اور حسنِ مطلق کی پرچھائیاں دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کے نزدیک نجات کا راستہ دنیوی زندگی کے کنارے کنارے بچ کر نکل جاتا ہے اور خدا کے قرب سے سرفراز ہونے کی سبیل بس یہ ہے کہ ایک طرف مذہب کے دیئے ہوئے نقشے پر اپنی زندگی کے ظاہری پہلوؤں کو ڈھال لیا جائے، دوسری طرف نفس کی صفائی کے چند طریقوں سے کام لے کر اُسے مجلّٰی و مصفا کر لیا جائے، اور پھر ایک محدود دائرے کے اندر کچھ مذہبی و روحانی مشاغل میں مصروف رہ کر زندگی کے دن پورے کر دیئے جائیں۔ گویا ان کے خدا کو چند خوش وضع شیشے کے برتن، چند مقطّع لاؤڈ اسپیکر، چند عمدہ گراموفون، چند لطیف ریڈیو سیٹ، چند خوشنما فوٹو کے کیمرے درکار تھے اور اسی غرض کے لیے اس نے زمین میں اتنا کچھ سامان دے کر انسانوں کو بھیجا تاکہ یہاں سے اپنے آپ کو اِن چیزوں میں تبدیل کر کے پھر اس کے پاس واپس پہنچ جائیں۔ مذہب و روحانیت کے اس غلط تصوّر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ جو نفوس بلند تر اور پاکیزہ تر اخلاقی صلاحیتوں کے حامل تھے انھیں یہ زندگی کے میدان سے ہٹا کر گوشوں میں لے گیا اور گھٹیا درجہ کے اوصاف رکھنے والوں کے لیے بغیر مزاحمت کے خود بہ خود میدان خالی ہو گیا۔

دنیا کی پوری مذہبی صورتِ حال کا یہ لبِ لباب ہے اور اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ

خدا پرستی سے جو اخلاقی طاقت انسان کو ملنی ممکن تھی، بیشتر انسان تو اس کو سرے سے حاصل ہی نہیں کر رہے ہیں، اور ایک بہت قلیل تعداد اس کو حاصل کر رہی ہے لیکن انسانیت کی رہ نمائی وسربراہ کاری سے وہ خود دست بردار ہوگئی ہے۔ اس لیے اس کا حال اس بیٹری کا سا ہے جس میں بجلی بھری جائے اور وہ یونہی رکھے رکھے اپنی عمر پوری کردے۔

انسانی تمدّن کی گاڑی بالفعل جولوگ اِس وقت چلارہے ہیں ان کے اخلاقیات خدا اور آخرت کے اساسی تخیل سے خالی ہیں اور دانستہ خالی کیے گئے ہیں۔ نیز اخلاق میں خدا کی رہ نمائی قبول کرنے سے انھوں نے قطعی انکار کردیا ہے۔ اگرچہ اُن میں کثیر التعداد لوگ کسی نہ کسی مذہب کے قائل ہیں، مگر ان کے نزدیک مذہب ہر انسان کا محض ایک شخصی وانفرادی معاملہ ہے جسے اپنی ذات تک آدمی کو محدود رکھنا چاہیے۔ اجتماعی زندگی اور اس کے معاملات سے مذہب کو کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ پھر اس کی کیا ضرورت کہ وہ اِن معاملات کو چلانے کے لیے کسی فوق الفطری ہدایت کی طرف رجوع کریں۔ گزشتہ صدی کے اواخر میں جس اخلاقی تحریک کی ابتدا امریکہ سے ہوئی تھی اور جو بڑھتے بڑھتے انگلستان اور دوسرے ممالک میں پھیل گئی، اس کا بنیادی مسلک ''امریکی انجمنِ اخلاق'' (American Ethical Union) کے مقاصد کی فہرست میں بایں الفاظ واضح کیا گیا تھا:

> ''انسانی زندگی کے تمام تعلقات میں، خواہ وہ شخصی ہوں، اجتماعی ہوں، قومی ہوں یا بین الاقوامی، اخلاق کی انتہائی اہمیت پر زور دینا بغیر اس کے کہ مذہبی معتقدات یا مابعد الطبیعی تخیلات کا اس میں کوئی دخل ہو۔''

اِس تحریک کے زیر اثر انگلستان میں ''اتحادِ انجمن ہائے اخلاق'' (Union Of Ethical Societies) قائم ہوئی جو بعد کو ''اخلاقی اتحاد'' (Ethical Union) کے نام سے منظّم کی گئی۔ اُس کا اساسی مقصد یہ بیان کیا گیا تھا:

> ''انسانی رفاقت اور خدمت کے ایک ایسے طریقے کی تلقین کرنا جو اس اصول پر مبنی ہو کہ مذہب کا سب سے بڑا مقصد بھلائی کی محبت ہے اور یہ کہ اخلاقی تصوّرات اور اخلاقی زندگی کے لیے دُنیا کی حقیقت اور زندگی بعد موت کے متعلق کسی عقیدے کی حاجت نہیں ہے، اور یہ کہ خالص انسانی اور فطری ذرائع سے انسانوں کو اپنے تمام تعلقاتِ زندگی میں حق سے محبت کرنے، حق جاننے اور حق پر عمل کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔''

اِن الفاظ میں درحقیقت اُس پورے طبقے کی نمائندگی کی گئی ہے جو اِس وقت دنیا کے افکار،

تہذیب، تمدّن اور معاملات کی رہ نمائی کر رہا ہے۔ آج دنیا کے کاروبار کو عملاً جو لوگ چلا رہے ہیں اُن سب کے ذہن پر وہی تخیل چھایا ہوا ہے جو اوپر کے چند فقروں میں بیان کیا گیا ہے۔ سب ہی نے بالفعل اپنے اخلاقیات کو خدا اور آخرت کے عقیدے اور مذہب کی اخلاقی رہ نمائی سے آزاد کرلیا ہے۔ وہ اگر خدا کو مانتے بھی ہیں تو صرف اس کے ہونے کو مانتے ہیں۔ اپنی زندگی کے اصول اور ضابطے اس سے نہیں لیتے۔

اب ہمیں اِن غیر مذہبی اخلاقی فلسفوں کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہیے کہ ان کی کیا کیفیت ہے۔

(ا) فلسفۂ اخلاق کا پہلا بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ اصلی اور انتہائی بھلائی کیا ہے جس کو پہنچنا انسانی سعی وعمل کا مقصود ہونا چاہیے اور جس کے معیار پر انسان کے طرزِ عمل کو پرکھ کر فیصلہ کیا جائے کہ وہ اچھا ہے یا بُرا، صحیح ہے یا غلط؟

اِس سوال کا کوئی ایک جواب انسان نہیں پا سکا۔ اس کے بہت سے جوابات ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک وہ بھلائی خوشی ہے۔ دوسرے کے نزدیک کمال ہے۔ تیسرے کے نزدیک فرض برائے فرض ہے۔

پھر خوشی کے متعلق مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ کیسی خوشی؟ آیا وہ جو جسمانی ونفسانی خواہشات کے پورا ہونے سے حاصل ہوتی ہے؟ یا وہ جو ذہنی ترقی کے مدارج پر چڑھنے سے حاصل ہوتی ہے؟ یا وہ جو اپنی شخصیت کو آرٹ یا روحانیت کے نقطۂ نظر سے آراستہ کرلینے سے حاصل ہوتی ہے؟ نیز یہ کہ کس کی خوشی؟ آیا ہر شخص کی اپنی خوشی؟ یا اُس جماعت کی خوشی جس سے انسان وابستہ ہے؟ یا تمام انسانوں کی خوشی؟ یا فی الجملہ دوسروں کی خوشی؟

اسی طرح کمال کو مقصود قرار دینے والوں کے لیے بھی بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کمال کا تصوّر اور اس کا معیار کیا ہے؟ اور کمال کس کا مقصود ہے؟ فرد کا؟ جماعت کا؟ یا انسانیت کا؟

اسی طرح جو لوگ فرض برائے فرض کے قائل ہیں اور ایک غیر مشروط واجب الاطاعت قانونِ فرض (Categorical Imperative) کی بے چون وچرا اطاعت ہی کو آخری وانتہائی بھلائی قرار دیتے ہیں ان کے لیے بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قانون فی الواقع ہے کیا؟ کس نے اس کو بنایا؟ اور کس کا قانون ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہے؟

ان تمام سوالات کے جوابات مختلف گروہوں کے نزدیک مختلف ہیں۔ محض فلسفہ کی کتابوں ہی میں مختلف نہیں ہیں بلکہ عملاً بھی مختلف ہیں۔ یہ ساری انسانوں کی بھیڑ جو آپ کے سامنے تمدّنِ انسانی کی گاڑی کو چلا رہی ہے، جس میں سلطنتوں کو چلانے والے وزیر، فوجوں کو لڑانے والے جنرل، انسانوں کے درمیان

فیصلہ کرنے والے جج، انسانی معاملات کے قانون بنانے والے شارعین (Legislators)، انسانوں کو تیار کرنے والے معلم، انسان کے معاشی ذرائع کو کنٹرول کرنے والے کاروباری لوگ اور تمدّن کے کارخانے میں کام کرنے والے مختلف مدارج کے کارکن، سب ہی شامل ہیں، ان کے پاس بھلائی کا کوئی ایک معیار نہیں ہے، بلکہ ہر ایک شخص اور ہر ایک گروہ اپنا الگ معیار رکھتا ہے اور ایک تمدّنی نظام میں کام کرتے ہوئے بھی ہر ایک کا رُخ ایک الگ مقصود کی طرف پھرا ہوا ہے۔ کسی کے نزدیک اپنی خوشی منتہا ہے اور خوشی سے اس کی مراد نفسانی و جسمانی خواہشات کی تکمیل ہے۔ کوئی اپنی خوشی کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اس کے ذہن میں خوشی سے کچھ اور مراد ہے۔ اس ذاتی خوشی کے حصول اور عدمِ حصول ہی کے لحاظ سے وہ فیصلہ کر رہا ہے کہ اجتماعی زندگی میں اس کے لیے کون سا طرزِ عمل نیک ہے یا بد۔ مگر اُس کی ظاہری شریفانہ صورت سے ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی کے لیے وہ ایک موزوں وزیر یا جج، یا معلم یا کسی دوسری حیثیت سے تمدّن کی مشین کا ایک اچھا پرزہ ہے۔ اسی طرح کوئی خوشی سے مراد انسانوں کے اُس مخصوص مجموعہ کی خوشی و خوش حالی سمجھتا ہے جس کے ساتھ اس کی دلچسپیاں وابستہ ہیں اور یہی اس کے نزدیک وہ خیرِ برتر ہے جس کے حصول کی سعی کرنا اس کے نزدیک نیکی ہے۔ یہ نقطۂ نظر اُسے اپنے طبقے یا برادری یا قوم کے سوا ہر ایک کے لیے سانپ اور بچھو بنا دیتا ہے لیکن ہم اس کی ظاہری مہذب صورت کی وجہ سے اس کو ایک شریف انسان فرض کر لیتے ہیں۔ اور وہ امانتیں اس کے حوالے کر دیتے ہیں جن میں اس کے اپنے طبقے یا برادری یا قوم کے سوا دوسروں کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ ایسی ہی مختلف اقسام کی شخصیتیں کمال کو خیرِ اعلیٰ ماننے والوں اور فرض برائے فرض کے قائلین میں بھی پائی جاتی ہیں جن میں سے اکثر کے نظریات اپنے عملی نتائج کے اعتبار سے انسانی تہذیب و تمدّن کے لیے زہر کا حکم رکھتے ہیں، مگر وہ تریاق کا لیبل لگائے ہوئے ہماری اجتماعی زندگی میں جذب ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

اب آگے چلیے۔ فلسفۂ اخلاق کے بنیادی سوالات میں سے دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس خیر و شر کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ کس ماخذ کی طرف ہم یہ معلوم کرنے کے لیے رجوع کریں کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا، صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟

اس سوال کا بھی کوئی ایک جواب انسان کو نہیں ملا۔ اس کے بھی بہت سے جوابات ہیں۔ کسی کے نزدیک وہ ذریعہ اور ماخذ انسانیت کا تجربہ ہے، کسی کے نزدیک قوانینِ حیات اور حالاتِ وجود

کا علم ہے، کسی کے نزدیک وجدان ہے، کسی کے نزدیک عقل ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ بدنظمی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جس کا آپ نے پہلے سوال کے معاملہ میں مشاہدہ کیا۔ اِن چیزوں کو ماخذ قرار دینے کے بعد اخلاق کے لیے مستقل اصول ہی یہ قرار پاجاتا ہے کہ اس کا کوئی متعین معیار نہ ہو، بلکہ وہ ایک سیّال مادّے کی طرح بہتا اور مختلف صورتوں اور پیمانوں میں ڈھلتا چلا جائے۔

انسانیت کے تجربے سے صحیح علم حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کے متعلق مکمل اور مفصّل معلومات یکجا جمع ہوں اور کوئی ہمہ بیں اور کامِل متوازن ذہن ان سے نتائج اخذ کرے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں حاصل نہیں ہیں۔ اوّل تو انسانیت کا تجربہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ جاری ہے۔ پھر اب تک کا جو تجربہ ہے اس کے بھی مختلف اجزا مختلف لوگوں کے سامنے ہیں اور وہ مختلف طور پر اپنی ذہنیت کے مطابق اُن سے نتائج نکال رہے ہیں۔ تو کیا اِن ناقص معلومات سے مختلف نامکمل ذہن اپنے رجحانات کے مطابق جو نتائج بھی اخذ کرلیں وہ سب صحیح ہوسکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو کیسے سخت بیمار ہیں وہ ذہن جو اپنے خیر وشر کو جاننے کے لیے اس ذریعۂ علم کو کافی سمجھتے ہیں۔

یہی معاملہ قوانینِ حیات اور حالاتِ وجود کا ہے۔ یا تو آپ اخلاقی بھلائی اور برائی کو جاننے کے لیے اُس وقت کا انتظار کریں جب اِن قوانین اور حالات کا علم قابلِ اطمینان حد تک آپ کی گرفت میں آجائے۔ یا نہیں تو ناکافی معلومات کو ناکافی جانتے ہوئے انھی کی بنیاد پر مختلف ذہنیت اور مختلف مراتب علمی کے لوگ مختلف طور پر فیصلے کرتے رہیں کہ اُن کے لیے خیر کیا ہے اور شر کیا۔ اور علم کی ہر نئی قسط حاصل ہونے کے بعد ان فیصلوں کو بدلتے بھی رہیں۔ حتیٰ کہ آج کا خیر کل شر ہوجائے اور آج کا شر کل خیر قرار پائے۔

عقل اور وجدان کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ بلاشبہ خیر وشر کو جاننے کی کچھ استعداد عقل کو بھی حاصل ہے اور اس عقل سے ہر انسان نے کچھ نہ کچھ حصہ پایا ہے، اور خیر وشر کا کچھ علم وجدانی بھی ہے جس کا الہام ہر انسان کے ضمیر پر فطرتاً ہوتا ہے۔ لیکن اس علم کے لیے ان میں سے کوئی بھی کافی بالذّات نہیں کہ اسی کو آخری اور واحد ذریعۂ علم کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ عقل یا وجدان، جس کو بھی آپ کافی بالذات سمجھیں گے، بہ ہر حال ایک ایسے ذریعۂ علم پر آپ اعتماد کریں گے جو نہ صرف یہ کہ اپنی فطرت میں ناقص ومحدود ہے، بلکہ وہ مختلف اشخاص، مختلف طبقوں، مختلف حالات اور مختلف زمانوں میں پہنچ کر بالکل مختلف چیزوں پر خیر یا شر ہونے کا حکم لگاتا ہے۔

یہ ساری بدنظمی جس کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے، محض علمی مقالات اور فلسفیانہ بحثوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ فی الواقع دنیا کے تمدن وتہذیب میں عملاً اس کا عکس پوری طرح نمایاں ہو رہا ہے۔ آپ کے تمدن میں جو لوگ کام کر رہے ہیں، خواہ وہ کارفرمائی کے مقام پر ہوں، یا کارکنی کے مقام پر یا کارفرماؤں اور کارکنوں کے بنانے میں لگے ہوئے ہوں، یہ سب خیر وشر اور صحیح وغلط جاننے کے لیے اپنے اپنے طور پر انھی مختلف ماخذوں کی طرف رجوع کر رہے ہیں، اور ہر شخص اور ہر گروہ کا خیر وشر دوسرے کے خیر وشر سے الگ ہے حتیٰ کہ ایک کا خیر دوسرے کا انتہائی شر ہے اور ایک کا شر دوسرے کا انتہائی خیر۔ اس بدنظمی نے اخلاق کے لیے کوئی پائیدار بنیاد باقی ہی نہیں رہنے دی ہے۔ جن چیزوں کو دنیا میں ہمیشہ سے جُرم اور گناہ سمجھا جاتا رہا ہے آج کسی نہ کسی گروہ کی نگاہ میں وہ عین خیر ہیں یا مطلقاً خیر نہیں تو اضافی خیر بن گئی ہیں۔ اسی طرح جن بھلائیوں کو ہمیشہ سے انسانی خوبی سمجھتا رہا ہے ان میں سے اکثر آج حماقت اور مضحکہ قرار پا چکی ہیں اور مختلف گروہ اُن کو شرم کے ساتھ نہیں بلکہ فخر کے ساتھ علانیہ پامال کر رہے ہیں۔ پہلے جھوٹا جھوٹ بولتا تھا مگر معیارِ اخلاق سچائی ہی کو مانتا تھا، لیکن آج کے فلسفوں نے جھوٹ کو خیر بنا دیا ہے اور جھوٹ بولنے کا ایک مستقل فن مدوّن کیا جا رہا ہے، اور بڑے پیمانے پر قومیں اور سلطنتیں جھوٹ پھیلا رہی ہیں۔ یہی حال ہر بداخلاقی کا ہے کہ پہلے بداخلاقیاں، بداخلاقیاں ہی تھیں مگر آج نئے فلسفوں کے طفیل وہ سب مطلق یا اضافی خیر میں تبدیل کر دی گئی ہیں۔

فلسفۂ اخلاق کے بنیادی سوالات میں سے تیسرا سوال یہ ہے کہ قانون اخلاق کے پیچھے وہ قوت کون سی ہے جس کے زور سے یہ قانون نافذ ہو؟ اس کے جواب میں مسرت اور کمال کے پرستار کہتے ہیں کہ خوشی یا کمال کی طرف لے جانے والی بھلائیاں اپنی پیروی کرانے کی طاقت آپ ہی اپنے اندر رکھتی ہیں اور رنج یا پستی کی طرف لے جانے والی برائیاں آپ اپنے ہی زور پر اپنے سے اجتناب کرا لیتی ہیں۔ اِس کے سوا قانونِ اخلاق کے لیے کسی خارجی اقتدار کی ضرورت ہی نہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قانونِ فرض انسان کے ارادۂ معقول کا اپنے اوپر آپ عائد کیا ہوا قانون ہے، اس کے لیے کسی بیرونی زور کی حاجت نہیں۔ تیسرا گروہ سیاسی اقتدار کو قانونِ اخلاق کی اصل قوتِ نافذہ سمجھتا ہے اور اس مسلک کی رُو سے اسٹیٹ کی طرف وہ تمام اختیارات منتقل ہو جاتے ہیں جو پہلے خدا کے لیے تھے، یعنی باشندوں کے حق میں یہ فیصلہ کرنا کہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ چوتھے گروہ نے یہ مرتبہ اسٹیٹ کے بہ جائے سوسائٹی کو دیا ہے۔ یہ سب جوابات فساد کی بے شمار صورتیں دنیا میں عملاً پیدا کر چکے ہیں

اوراب تک کر رہے ہیں۔ پہلے دونوں جوابوں نے انفرادی خودسری و بے راہ روی یہاں تک بڑھادی کہ اجتماعی زندگی کا شیرازہ درہم برہم ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ پھراس کا ردِعمل اُن فلسفوں کی صورت میں رونما ہوا جنھوں نے یا تو اسٹیٹ کو خدا بنا کر افراد کو بالکل اس کا بندہ بنا ڈالا یا پھر افراد کی روٹی کے ساتھ ان کے خیر و شر کی باگیں بھی معاشرے کے ہاتھوں میں دے دیں، حالاں کہ سبوح وقدوس نہ اسٹیٹ ہے نہ معاشرہ۔

یہی معاملہ اِس سوال کے جواب میں پیش آتا ہے کہ وہ کون سا محرک ہے جو انسان کو اپنے طبعی رجحانات کے علی الرغم اخلاقی احکام کی پابندی پر آمادہ کرے؟ کسی کے نزدیک بس خوشی کی طمع اور رنج وتکلیف کا خوف اس کے لیے کافی محرک ہے۔ کوئی محض کمال کی خواہش اور نقص سے بچنے کی تمنا کو اس کے لیے کافی سمجھتا ہے۔ کوئی اس کے لیے محض آدمی کے اپنے جذبۂ احترم قانون پر اعتماد کرتا ہے۔ کوئی اسٹیٹ کے اجر کی امید اور اس کے غضب کے خوف کو اہمیت دیتا ہے۔ اور کوئی معاشرے کے اجر اور اس کے غضب کو طمع وخوف کے لیے استعمال کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے۔ ان میں سے ہر جواب نے عملاً ہمارے اخلاقی نظامات میں سے کسی نہ کسی کے اندر تقدم کا مقام حاصل کیا ہے، اور تھوڑا سا تجسّس کرنے پر یہ حقیقت بآسانی کھل سکتی ہے کہ یہ سب محرکات بداخلاقی کے لیے بھی اُتنے ہی اچھے محرک بن سکتے ہیں جتنے خوش اخلاقی کے لیے۔ بلکہ ان میں بداخلاقی کے لیے محرک بننے کی قوت بہت زیادہ ہے، اور بہ ہر حال کسی اعلیٰ درجہ کی اخلاقیت کے لیے تو یہ تمام محرکات قطعاً ناکافی ہیں۔

یہ بہت مختصر جائزہ جو میں نے دنیا کی موجودہ اخلاقی حالت کا لیا ہے اس سے بیک نظر یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اِس وقت ایک ہمہ گیر اخلاقی انتشار پایا جاتا ہے۔ خدا سے بے نیاز ہوکر انسان کوئی ایسی بنیاد نہیں پا سکا جس پر وہ قابلِ اطمینان طریقے سے اپنے اخلاق کی تعمیر کرتا۔ اخلاق کے سارے بنیادی سوالات اس کے لیے حقیقۃً لاجواب ہوکر رہ گئے۔ نہ وہ اُس خیرِ برتر کا کہیں سراغ لگا سکا جو اس کی کوششوں کا منتہا بننے کے قابل ہوتی اور جس کے لحاظ سے اعمال کے نیک یا بد اور صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا۔ نہ اسے وہ ماخذ کہیں ہاتھ لگا جس سے وہ صحیح طور پر معلوم کر سکتا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا۔ نہ اسے وہ اقتدار فراہم کرنے میں کام یابی ہوئی جس کے حکم کی بنا پر اخلاق کے کسی بلند، جامع اور عالم گیر ضابطہ کو قوتِ نفاذ حاصل ہوتی۔ اور نہ اسے کوئی ایسا محرک مل سکا جو انسانوں میں راستی پر عمل کرنے اور ناراستی سے پرہیز کرنے کے لیے حقیقی آمادگی پیدا کرنے کے قابل ہو۔ خدا سے بغاوت کر کے انسان نے خودسری کے ساتھ اِن سوالات کو حل کرنا چاہا اور اپنے نزدیک حل کیا بھی، مگر یہ اُسی حل کے پیدا کردہ نتائج ہیں جو آج

ہم کو اخلاقی تنزّل کے ایک خوف ناک طوفان کی شکل میں اُٹھتے اور پوری انسانی تہذیب کو تباہی کی دھمکیاں دیتے نظر آرہے ہیں۔

کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم اُس بنیاد کو تلاش کریں جس پر انسانی اخلاق کی صحیح تعمیر ہو سکے؟ فی الواقع یہ تلاش و جستجو محض ایک علمی بحث نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کی ایک عملی ضرورت ہے اور وقت کی نزاکت نے اس کو اہم ترین ضرورت بنا دیا ہے۔ اسی لحاظ سے میں اپنی تلاش کے نتائج پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جو لوگ اس ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں وہ نہ صرف میرے ان نتائج پر ٹھنڈے دل سے غور کریں بلکہ خود بھی سوچیں کہ اخلاقِ انسانی کے لیے آخر کون سی بنیاد صحیح ہو سکتی ہے۔

میں اپنی تلاش و تحقیق سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اخلاق کے لیے صرف ایک ہی بنیاد صحیح ہے اور وہ اسلام فراہم کرتا ہے۔ یہاں فلسفۂ اخلاق کے تمام بنیادی سوالات کا جواب ہم کو ملتا ہے اور ایسا جواب ملتا ہے جس کے اندر وہ کم زوریاں موجود نہیں ہیں جو فلسفیانہ جوابات میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں مذہبی اخلاقیات کی ان کم زوریوں میں سے بھی کوئی کم زوری موجود نہیں ہے جن کی وجہ سے وہ نہ کسی مستحکم سیرت کی تعمیر کر سکتے ہیں اور نہ انسان کو تمدّن کی وسیع ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بناتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی ہمہ گیر اخلاقی رہ نمائی ملتی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کے انتہائی ممکن درجات تک ہمیں لے جا سکتی ہے۔ یہاں وہ اخلاقی اصول ہم کو ملتے ہیں جن پر ایک صالح ترین نظامِ تمدّن قائم ہو سکتا ہے اور اگر ان اصولوں پر انفرادی و اجتماعی کردار کی بنا رکھی جائے تو انسانی زندگی اُس فساد سے محفوظ رہ سکتی ہے جس سے وہ اس وقت دوچار ہے۔

اس نتیجہ پر میں کن دلائل سے پہنچا ہوں؟ اس کی مختصر تشریح میں آپ کے سامنے بیان کروں گا۔

فلسفہ جس مقام سے اپنی اخلاقی بحث شروع کرتا ہے درحقیقت وہ اخلاق کے مسئلے کا سرا نہیں ہے بلکہ بیچ کے چند نقطے ہیں، جنھیں سرے کو چھوڑ کر اُس نے نقطۂ آغاز بنا لیا ہے اور یہی اس کی پہلی غلطی ہے۔ یہ سوال کہ انسان کے لیے کردار کی صحت و غلطی کا معیار کیا ہے اور وہ کون سی بھلائی ہے جس کو پہنچنے کی سعی انسان کے لیے مقصود بالذات ہونی چاہیے دراصل یہ بعد کا سوال ہے۔ اس سے پہلے جو سوال حل ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ یہ سوال اس لیے تمام سوالات پر مقدم ہے کہ حیثیت کے تعیّن کے بغیر اخلاق کا سوال محض بے معنی ہی نہیں ہو جاتا بلکہ اس میں بیشتر امکان اسی امر کا ہوتا ہے کہ اس طرح جو اخلاقیات متعین کیے جائیں گے وہ بنیادی طور پر غلط ہوں گے۔ مثلاً کسی

جائداد کے متعلق آپ کو یہ طے کرنا ہے کہ اس میں کس طرح مجھے کام کرنا چاہیے اور کس قسم کے تصرّفات میرے لیے حق ہیں اور کس قسم کے تصرّفات باطل۔ کیا آپ اس سوال کو صحیح طور پر حل کر سکتے ہیں تاوقتیکہ پہلے اس بات کا تعیّن نہ کرلیں کہ اس جائداد میں آپ کی حیثیت کیا ہے اور اس سے آپ کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اگر یہ جائداد کسی دوسرے کی ملکیت ہے اور آپ اس میں امین کی حیثیت رکھتے ہیں تو آپ کے لیے اس میں اخلاقی طرزِ عمل کی نوعیت کچھ اور ہوگی اور اگر آپ خود اس کے مالک ہیں اور اس پر آپ کے مالکانہ اختیارات غیر محدود ہیں تو آپ کے لیے اس میں اخلاقی طرزِ عمل کی نوعیت کچھ اور ہوگی اور اگر آپ خود اس کے مالک ہیں اور اس پر آپ کے مالکانہ اختیارات غیر محدود ہیں تو آپ کے اخلاقی طرزِ عمل کی نوعیت بالکل دوسری ہو جائے گی۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ حیثیت کا سوال اخلاقی طرزِ عمل کی نوعیت کے معاملہ میں فیصلہ کن ہے بلکہ درحقیقت اسی پر اس امر کے فیصلہ کا بھی انحصار ہے کہ اس جائداد میں آپ کے لیے صحیح طرزِ عمل متعیّن کرنے کا حق دار کون ہے؟ آپ خود یا وہ جس کے آپ امین ہیں؟

اسلام سب سے پہلے اِسی سوال کی طرف توجہ کرتا ہے اور ہمیں بالکل واضح طور پر ہر شائبۂ اشتباہ کے بغیر یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت خدا کے بندے اور نائب کی ہے۔ یہاں انسان کو جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے وہ سب خدا کی ملک ہیں۔ حتیٰ کہ انسان کا اپنا جسم اور وہ تمام قوتیں بھی جو اس جسم میں بھری ہوئی ہیں، انسان کی اپنی مِلک نہیں ہیں بلکہ خدا کی ملک ہیں۔ خدا نے اس کو ان تمام چیزوں پر تصرّف کرنے کے اختیارات دے کر یہاں اپنے نائب کی حیثیت سے مامور کیا ہے، اور اس ماموریت میں اُس کا امتحان ہے۔ امتحان کا آخری نتیجہ اِس دنیا میں نہیں نکلے گا بلکہ جب افراد کا، قوموں کا اور پوری نوع انسانی کا کام ختم ہو چکے گا اور انسانوں کی مساعی کے اثرات ونتائج پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے۔ تب خدا ایک وقت ان سب کا حساب لے گا اور اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ کس نے اس کی بندگی اور نیابت کا حق ٹھیک ادا کیا ہے اور کس نے نہیں کیا۔ یہ امتحان کسی ایک امر میں نہیں بلکہ تمام امور میں ہے۔ کسی ایک شعبۂ زندگی میں نہیں بلکہ بہ حیثیت مجموعی پوری زندگی میں ہے۔ نفس وجسم کی جتنی قوتیں انسان کو دی گئی ہیں سب کا امتحان ہے اور خارج میں جن جن چیزوں پر جس جس طرح کے اختیارات اسے عطا کیے گئے ہیں، ان سب میں بھی امتحان ہے کہ وہ کس طرح ان پر اپنا اختیار استعمال کرتا ہے۔

حیثیت کے اِس تعین کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں اپنے لیے اخلاقی طرزِ عمل کے تعین کا حق

ہی سرے سے انسان کو حاصل نہیں رہتا، بلکہ اس کا فیصلہ کرنا خدا کا حق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فلسفۂ اخلاق کے وہ تمام سوالات جن کو فلسفیوں نے چھیڑا ہے، نہ صرف یہ کہ حل ہو جاتے ہیں بلکہ اس امر کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ایک ایک سوال کے چھتیس چھتیس جوابات ہوں اور ایک ایک جواب پر انسانوں کا ایک ایک گروہ اخلاق کے ایک جداگانہ رُخ پر چل پڑے اور ایک ہی تمدنی و اجتماعی زندگی میں رہتے ہوئے یہ مختلف سمتوں پر چلنے والے لوگ اپنی بے راہ رویوں سے بدنظمی، انتشار اور فساد برپا کریں۔ اگر انسان کی اُس حیثیت کو تسلیم کرلیا جائے جو اسلام نے قرار دی ہے تو یہ بات خود متعین ہو جاتی ہے کہ خدا کے امتحان میں کام یاب ہونا اور اس کی رضا کو پہنچنا ہی وہ بلند ترین بھلائی ہے جو مقصود بالذات ہونی چاہیے، اور کسی طرزِ عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا مدار اسی امر پر ہے کہ وہ اس بھلائی کے حصول میں کہاں تک مددگار یا مانع ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی یہیں سے متعین ہو جاتی ہے کہ انسان کے لیے نیک اور بد، صحیح اور غلط کے علم کا اصل ماخذ خدا کی ہدایت ہے اور اس کے سوا دوسرے ذرائع علم اس اصل ماخذ کے مددگار تو بن سکتے ہیں مگر خود اصل ماخذ نہیں بن سکتے۔ نیز یہ امر بھی طے ہو جاتا ہے کہ قانونِ اخلاق کے واجب الاطاعت ہونے کی اصل بنیاد صرف یہ ہے کہ وہ خدا کا ٹھیرایا ہوا قانون ہے۔ اور یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ اچھے اخلاق کی پابندی اور بُرے اخلاق سے اجتناب کے لیے اصل محرک خدا کی محبت، اس کی رضا کی طلب اور اس کی ناراضی کا خوف ہونا چاہیے۔

پھر نہ صرف یہ کہ اس سے فلسفۂ اخلاق کے سارے اصولی سوالات حل ہو جاتے ہیں بلکہ درحقیقت اس بنیاد پر جو اخلاقی سسٹم بنتا ہے اس کے اندر نہایت متوازن اور متناسب طریقے سے وہ تمام اخلاقی سسٹم اپنی اپنی موزوں جگہ پا لیتے ہیں جو فلسفۂ اخلاق کے مفکرین نے تجویز کیے ہیں۔ فلسفیانہ اخلاقی نظاموں کی اصل قباحت یہ نہیں ہے کہ ان میں حقیقت و صداقت کا کوئی جز بھی نہیں ہے۔ بلکہ ان کی اصل قباحت یہ ہے کہ انھوں نے صداقت کے ایک جز کو لے کر پوری صداقت بنا لیا ہے اس لیے جز کے کل بننے میں جس قدر زائد کی ضرورت پڑتی ہے اس کی تکمیل کے لیے لامحالہ انھیں باطل کے بہت سے اجزاء لینے پڑتے ہیں۔ اسلام اس کے برعکس پوری صداقت پیش کرتا ہے اور اس کل صداقت میں وہ تمام جزئی صداقتیں جذب ہو جاتی ہیں جو لوگوں کے پاس الگ الگ تھیں اور ناقص تھیں۔

یہاں خوشی کا بھی ایک مقام ہے، مگراس سے مراد وہ خوشی وخوش حالی ہے جو خدا کے قانون کی پیروی سے اوراس کے نتیجہ میں حاصل ہو۔ اور یہ خوشی وخوش حالی جسمانی و مادّی بھی ہے، ذہنی و نفسی بھی، آرٹسٹک اور روحانی بھی۔ نیز یہ خوشی وخوش حالی فرد کی بھی ہے، جماعت کی بھی اور تمام انسانیت کی بھی۔ ان مختلف خوشیوں میں تصادم نہیں بلکہ توافق ہے۔

یہاں کمال کا بھی ایک مقام ہے، مگر وہ کمال جو خدا کے امتحان میں سوفی صدی نمبر پانے کا مستحق ہو۔ اور یہ فرد کا، جماعت کا، قوم کا، پوری انسانیت کا، غرض سب ہی کا کمال ہے۔ صحیح اخلاقی طرزِ عمل وہ ہے جس سے ہر فرد نہ صرف خود کمال کی طرف ترقی کرے بلکہ د۔ سروں کی تکمیل میں بھی مددگار رہو اور کوئی کسی کی تکمیل میں مزاحم نہ ہو۔

یہاں کانٹ کے ''قطعی واجب الاطاعت'' (Categorical) (Imperative) کو بھی پوری عزت کی جگہ مل جاتی ہے، اوراس جہاز کو وہ لنگر بھی مل جاتا ہے جس کے بغیر یہ فلسفہ کے دریا میں ڈگمگا رہا تھا۔ جس قطعی واجب الاطاعت قانون کا ذکر کانٹ نے کیا ہے اور جس کی وہ خود کوئی توضیح نہ کرسکا، دراصل وہ خدا کا قانون ہے۔ خدا ہی کی طرف سے اس کی صورت معین کی گئی ہے، خدا ہی کا قانون ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہے اوراسی کی بے چون وچرا اطاعت کا نام نیکی ہے۔

اسی طرح یہاں اخلاقی خیر وشر کے علم کا جو ماخذ ہمیں بتایا گیا ہے وہ اُن دوسرے ذرائع علم کی نفی نہیں کرتا جن کی طرف فلاسفہ رجوع کرتے ہیں بلکہ ان سب کو ایک سسٹم کا جز بنالیتا ہے۔ البتہ وہ نفی جس چیز کی کرتا ہے وہ صرف یہ بات ہے کہ اُنھیں، یا اُن میں سے کسی ایک کو اصلی اور آخری ذریعۂ علم کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ خدا کی ہدایت کے ذریعہ سے خیر وشر کا جو علم ہمیں بخشا گیا ہے وہ اصل علم ہے۔ رہا تجربی علم، قوانینِ حیات اور حالات وجود سے استنباط کیا ہوا علم، عقلی علم، اور وجدانی علم، تو یہ سب اُس اصلی علم کے شواہد ہیں۔ جن چیزوں کو خدا کی ہدایت خیر کہتی ہے، انسانیت کا تجربہ ان کے خیر ہونے پر شہادت دیتا ہے، قوانینِ حیات اس کی تصدیق کرتے ہیں، عقل اور وجدان دونوں اس پر گواہ ہیں۔ لیکن معیارِ صداقت خدائی ہدایت ہی ہے نہ کہ یہ ذرائع علم۔ انسانیت کے تاریخی تجربات سے، یا قوانین حیات سے اگر کوئی ایسا استنباط کیا جائے یا عقل اور وجدان سے کوئی ایسی رائے قائم کی جائے جو خدا کی ہدایت کے خلاف ہو تو اصل اعتبار خدا کی ہدایت کا کیا جائے گا نہ کہ اُس استنباط یا اُس رائے کا۔ ہمارے پاس علم کا ایک مستند معیار ہونے کا فائدہ ہی یہ ہے کہ ہمارے علوم میں ڈسپلن پیدا ہو اور ہم اُس انارکی اور

بدنظمی سے بچ جائیں جو کسی معیار کے نہ ہونے اور اِعجاب کل ذی رأیٍ برایہٖ سے پیدا ہوتی ہے۔

اسی طرح یہاں قانونِ اخلاق کی پشتیبان قوت (Sanction) اور محرکات کا مسئلہ بھی اس طور پر حل ہوتا ہے کہ اس سے اُن دوسری چیزوں کی نفی نہیں ہوتی جو فلسفیوں نے تجویز کی ہیں، بلکہ صرف اُن کی تصحیح ہو جاتی ہے، اور جن غلط حدود پر وہ پھیلا دی گئی ہیں یا خود پھیل جاتی ہیں وہاں سے ان کو ہٹا کر ایک جامع سسٹم میں ٹھیک مقام پر رکھ دیا جاتا ہے۔ خدا کا قانون، اس لیے کہ وہ خدا کا قانون ہے، اپنے قیام کی طاقت آپ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور یہ طاقت اُس مومن کے نفس میں بھی موجود ہے جو خدا کی رضا چاہنے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور خود اس کمال کا طالب ہے جو خدا کی طرف بڑھنے سے حاصل ہو، نیز یہ طاقت مومنین کی سوسائٹی اور اُس صالح ریاست میں بھی موجود ہے جو خدا کے قانون پر مبنی ہو۔ قانون کی پابندی پر مومن کو آمادہ کرنے والی چیز اُس کی خالص فرض شناسی بھی ہے، اُس کا حق کو حق جانتے ہوئے اسے پسند کرنا اور باطل کو باطل سمجھتے ہوئے اس سے نفرت کرنا بھی ہے، اور وہ طمع اور خوف بھی ہے جو وہ اپنے خدا سے رکھتا ہے۔

دیکھیے، اس طرح اسلام اُس پوری فکری اور عملی انارکی کو ختم کر دیتا ہے جو انسان کو بے خدا فرض کر کے اس کے لیے ایک نظامِ اخلاق تجویز کرنے کی کوششوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد آگے چلیے۔ اسلام خدا کا جو تصوّر پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہی انسان کا اور ساری کائنات کا واحد مالک، خالق، معبود اور حاکم ہے۔ اس خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس کے ہاں بجز دعائے خیر کے کسی ایسی سفارش کی گنجائش بھی نہیں جو زور سے منوائی جاتی ہو اور ردّ نہ کی جاسکتی ہو۔ اس کے ہاں ہر شخص کی کامیابی و ناکامی کا مدار اس کے اپنے طرزِ عمل پر ہے۔ نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکتا ہے، نہ کسی کے عمل کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالی جاتی ہے، اور نہ کسی کے عمل کا صلہ دوسرے کو ملتا ہے۔ اس کے ہاں جانب داری نہیں کہ ایک شخص یا خاندان یا قوم یا نسل سے اس کو دوسرے کی بہ نسبت زیادہ دل چسپی ہو۔ سب انسان اس کی نگاہ میں یکساں ہیں، سب کے لیے ایک ہی قانونِ اخلاق ہے، اور فضیلت جو کچھ بھی ہے اخلاقی فضیلت کے اعتبار سے ہے۔ وہ خود رحیم ہے اور رحم کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود فیاض ہے اور فیاضی کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود غفور ہے اور درگزر کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود عادل ہے اور عدل کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود ظلم سے، تنگ نظری و تنگ دلی سے، بے رحمی و سنگ دلی سے، تعصب اور نفسانی جانب داری سے پاک ہے، اس لیے انھی کو پسند کرتا ہے جو ان صفات سے پاک ہوں۔ پھر کبریائی تنہا اسی کا حق ہے

اس لیے تکبّر اسے ناپسند ہے۔ خدائی صرف اُسی کے لیے ہے اور دوسرے سب اس کے بندے ہیں، اس لیے ایک بندے پر دوسرے کی خداوندی اس کو پسند نہیں۔ مالک وہ اکیلا ہے اور دوسروں کے پاس جو کچھ ہے امانت کی حیثیت سے ہے، اس لیے کسی بندے کی خودمختاری اور کسی کا کسی کے لیے قانون بنانا اور کسی کا کسی کے لیے بہ ذاتِ خود واجب الاطاعت ہونا یہ سب فی الحقیقت غلط ہے۔ سب کا مُطاع وہی ایک ہے اور سب کے لیے خیر اِسی میں ہے کہ اس کی بے چون و چرا اطاعت کریں۔ پھر وہ محسن ہے اور شکر، احسان مندی اور محبت کا مستحق ہے۔ وہ منعم ہے اور اس کا حق دار ہے کہ اس کی نعمتوں میں اسی کے منشا کے مطابق تصرف کیا جائے۔ وہ منصف ہے اور لازم ہے کہ انسان اس کے انصاف میں سزا پانے کا خوف اور جزا پانے کی طمع رکھے۔ وہ علیم و خبیر ہے اور دلوں کی چھپی ہوئی نیتوں سے بھی واقف ہے، اس لیے ظاہری حسنِ اخلاق سے اس کو دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ وہ محیط ہے اس لیے کوئی یہ امید بھی نہیں کرسکتا کہ جُرم کر کے اس کی پکڑ سے بچ نکلے گا۔

خدا کے اِس تصوّر پر غور کیجیے۔ اس سے بالکل ایک فطری نتیجہ کے طور پر انسان کے لیے ایک مکمل اخلاقی زندگی کا نقشہ وجود میں آتا ہے اور وہ نقشہ ان تمام کمزوریوں سے خالی ہے جو مشرکانہ مذاہب کے اخلاقیات اور دہریانہ مسلکوں کے اخلاقیات میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں نہ تو اخلاقی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے کے چور دروازے کہیں موجود ہیں، نہ ان ظالمانہ فلسفوں کے لیے کوئی جگہ ہے جن کی بنا پر انسان اپنی دل چسپیوں کے لحاظ سے عالمِ انسانیت کو تقسیم کر کے ایک حصہ کے لیے مجسم فرشتہ اور دوسرے حصہ کے لیے مجسم شیطان بن جاتا ہے۔ نہ دہریانہ اخلاقیات کی وہ بنیادی کمزوریاں اس میں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اخلاق میں کوئی استحکام پیدا نہیں ہوسکتا۔ اِن سلبی خوبیوں کے ساتھ اس نقشہ میں یہ ایجابی خوبی موجود ہے کہ یہ اخلاقی فضیلت کا ایک بلند ترین اور وسیع ترین منتہا پیش کرتا ہے جس کی وسعت اور بلندی کی کوئی حد نہیں، اور اُس منتہا کی طرف بڑھنے کے لیے ایسے محرکات فراہم کرتا ہے جو پاکیزہ ترین ہیں۔

پھر یہ تصوّر کہ امتحان کسی ایک چیز میں نہیں بلکہ اُن تمام چیزوں میں ہے جو خدا نے انسان کو دی ہیں، کسی ایک حیثیت میں نہیں بلکہ اُن تمام حیثیتوں میں ہے جو انسانوں کو یہاں حاصل ہیں، اور کسی ایک شعبۂ حیات میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں ہے، یہ اخلاق کے دائرے کو اُتنا ہی پھیلا دیتا ہے جتنا امتحان کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ انسان کی عقل، اس کے ذرائع علم، اس کی ذہنی و فکری قوتیں، اس کے

حواس، اس کے جذبات، اس کی خواہشات، اس کی جسمانی طاقتیں، سب کی سب امتحان میں شریک ہیں، یعنی امتحان آدمی کی پوری شخصیت کا ہے۔ پھر خارج کی دنیا میں جن جن اشیاء سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے، جن اشیاء پر وہ تصرّف کرتا ہے، جن انسانوں سے مختلف طور پر اس کو واسطہ پڑتا ہے، ان سب کے ساتھ اس کے برتاؤ میں امتحان ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس امر میں امتحان ہے کہ انسان یہ سب کچھ خدا کی خداوندی اور اپنی عبدیت و نیابت کے احساس کے ساتھ کر رہا ہے یا آزادی وخودمختاری کی ہوا میں مبتلا ہو کر؟ یا خدا کے سوا دوسروں کا بندہ بن کر؟ اس وسیع ترین تصوّرِ اخلاق میں وہ تنگی نہیں ہے جو مذہب کے محدود تصوّر سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ آدمی کو زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھاتا ہے، ہر میدان کی اخلاقی ذمہ داریاں اسے بتاتا ہے، اور وہ اخلاقی اصول اسے دیتا ہے جن کی پیروی کرنے سے وہ خدا کے اُس امتحان میں کام یاب ہو سکے جو ایک ایک میدان زندگی سے متعلق ہے۔

پھر یہ تصوّر کہ امتحان کا اصلی اور آخری فیصلہ اس زندگی میں نہیں بلکہ دوسری زندگی میں ہوگا اور حقیقی کام یابی و ناکامی وہ ہے جو وہاں ہو نہ کہ یہاں، یہ دنیا کی زندگی اور اس کے معاملات پر انسان کی نظر (Out Look) کو بنیادی طور پر بدل دیتا ہے۔ اس تصوّر کی وجہ سے وہ نتائج جو اس دنیا میں نکلتے ہیں ہمارے لیے حسن و قبح، صحت اور غلطی، حق اور باطل، اور کام یابی و ناکامی کے قطعی، اصلی اور آخری معیار نہیں رہتے۔ اس لیے قانونِ اخلاق کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا انحصار بھی اِن نتائج پر نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اس تصوّر کو قبول کرلے گا وہ قانونِ اخلاق کی پیروی پر بہ ہر حال ثابت قدم رہے گا خواہ اِس دنیا میں اس کا نتیجہ بہ ظاہر اچھا ہو یا بُرا، کام یابی کی صورت میں نکلتا نظر آئے یا ناکامی کی صورت میں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی نگاہ میں دنیوی نتائج بالکل ہی ناقابلِ لحاظ ہوں گے۔ بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ اصلی اور آخری لحاظ اِن کا نہیں بلکہ آخرت کے پائدار نتائج کا کرے گا اور اپنے لیے صحیح صرف اُس طرزِ عمل کو سمجھے گا جو اُن نتائج پر نگاہ رکھتے ہوئے اختیار کیا جائے۔ وہ کسی چیز کو چھوڑنے اور کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں کرے گا کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں وہ لذّت اور خوشی اور نفع کی موجب ہے یا نہیں بلکہ اس بنیاد پر کرے گا کہ زندگی کے آخری مرحلہ میں اپنے قطعی و حتمی نتائج کے اعتبار سے وہ کیسی ہے۔ اس طرح اس کا نظامِ اخلاق ترقی پذیر تو ضرور رہے گا مگر اس کے اصولِ اخلاق تغیر پذیر نہ ہوں گے، اور نہ اس کی سیرت ہی تلوّن پذیر ہوگی۔ یعنی تمدّن و تہذیب کے نشو ونما کے ساتھ ساتھ اُس کے اخلاقی تصوّرات میں وسعت تو یقیناً

ہوگی، مگر یہ ممکن نہ ہوگا کہ واقعات کی ہر کروٹ اور حالات کی ہر گردش کے ساتھ اخلاق کے اصول بھی بدلتے چلے جائیں اور آدمی ایک اخلاقی گرگٹ بن کر رہ جائے کہ اس کے اخلاقی رویہ میں سرے سے کوئی پائداری ہی نہ ہو۔

پس اخلاق کے نقطۂ نظر سے آخرت کا یہ اسلامی تصور دو اہم فائدے عطا کرتا ہے، جو کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک یہ کہ اس سے اصول اخلاق کو غایت درجہ کا استحکام نصیب ہوتا ہے، جس میں تزلزل کا کوئی خطرہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے انسان کی اخلاقی سیرت کو وہ استقامت میسر آتی ہے، جس میں (بشرط ایمان) انحراف کا کوئی اندیشہ نہیں۔ دنیا میں سچائی کے دس مختلف نتیجے نکل سکتے ہیں اور ان نتائج پر نگاہ رکھنے والا ایک ابن الوقت انسان مواقع اور امکانات کے لحاظ سے دس مختلف طرزِ عمل اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن آخرت میں سچائی کا نتیجہ لازماً ایک ہی ہے اور اس پر نظر رکھنے والا ایک مومن انسان دنیوی فائدے اور نقصان کا لحاظ کیے بغیر لازماً ایک ہی طرزِ عمل اختیار کرے گا۔ دنیوی نتائج کا اعتبار کیجیے تو خیر و شر کسی متعین چیز کا نام نہیں رہتا بلکہ ایک ہی چیز اپنے مختلف نتیجوں کے لحاظ سے کبھی خیر اور کبھی شر بنتی رہتی ہے اور اس کے اتباع میں دنیا پرست آدمی کا کردار بھی اپنی پوزیشن تبدیل کرتا رہتا ہے۔ لیکن آخرت کے نتائج پر نظر رکھیے تو خیر اور شر دونوں قطعی طور پر متعین ہو جاتے ہیں اور مومن بالآخرۃ آدمی کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ کبھی خیر کو بدانجام یا شر کو نیک انجام سمجھ کر اپنے کردار کو بدل دے۔

پھر یہ تصور کہ انسان اس دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے اور تصرف کے جو اختیارات یہاں اسے حاصل ہیں وہ سب دراصل نائب خدا ہونے کی حیثیت سے ہیں، انسانی زندگی کے لیے راستے اور مقصد دونوں کا تعین کر دیتا ہے۔ اس تصور سے لازم آتا ہے کہ انسان کے لیے خود مختاری اور بندگی غیر اور خداوندانہ بڑائی کے تمام رویے غلط ہوں اور صرف یہی ایک رویہ صحیح ہو کہ اپنے تمام تصرفات میں وہ خدا کی مرضی کا تابع اور اس کے نازل کردہ اخلاقی قانون کا پابند بن کر رہے۔ نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان ایک طرف تو اپنے اخلاقی رویہ میں ہر ایسے طرزِ عمل سے بہ شدّت اجتناب کرے، جس میں خود مختاری و بغاوت کا، یا خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کا، یا خداوندانہ کبریائی کا ذرہ برابر شائبہ پایا جاتا ہو، کیوں کہ یہ تینوں چیزیں اس کی نائبانہ حیثیت کے منافی ہیں، مگر دوسری طرف خدا کی املاک میں اس کا تصرف اور خدا کی پیدا کردہ قوتوں میں اس کا برتاؤ، اور خدا کی رعیت میں اس کی فرماں روائی اُس اخلاق اور اُس برتاؤ

کے عین مطابق ہو جو اس سلطنت کے اصل مالک اپنے ملک اور اپنی رعیت میں اختیار کررہا ہے، کیوں کہ نائبانہ حیثیت کا فطری اقتضا یہی ہے کہ نائب سلطان کی پالیسی خود سلطان کی پالیسی سے اور نائب سلطان کے اخلاق خود سلطان کے اخلاق سے منافی نہ ہوں۔ نیز اس تصور سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو قوتیں اللہ نے انسان کو عطا کی ہیں اور جو ذرائع اور وسائل اسے دنیا میں بخشے ہیں ان سب کو استعمال کرنے اور منشا الٰہی کے مطابق استعمال کرنے پر انسان مامور ہو۔ یعنی دوسرے الفاظ میں وہ نائبِ سلطان بھی سخت مجرم ہو جس نے سلطان کے منشا کے خلاف اس کی ملک اور اس کی رعیت میں تصرف کیا، اور وہ نائب بھی بڑا مجرم قرار پائے، جس نے سلطان کے دیے ہوئے اختیارات میں سے کسی اختیار کو سرے سے استعمال ہی نہ کیا بلکہ اس کی بخشی ہوئی قوتوں میں سے کسی قوت کو بلاوجہ ضائع کر دیا، اس کے بنائے ہوئے ذرائع و وسائل سے کام لینے میں جان بوجھ کر کوتاہی کی اور اُس ڈیوٹی سے منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا جس پر سلطان نے اسے مامور کیا تھا۔ نیز اس تصور سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ پوری نوعِ انسانی کی اجتماعی زندگی ایسے ڈھنگ پر قائم ہو کہ سارے انسان، یعنی خدا کے سب خلیفہ، ان ذمے داریوں کے ادا کرنے میں جو خدا نے ان پر عائد کی ہیں، ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں، اور نظام تمدن و عمران میں ایسی کوئی چیز کارفرما نہ رہے، جس کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان کی، یا انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کی خلافت کو عملاً سلب کر لے یا اس کے اجرا میں مانع و مزاحم ہو، بجز اُس صورت کے جب کہ کوئی انسان یا گروہ انسانی خلافت سے محروم ہو کر اپنے حقیقی سلطان سے بغاوت کا مرتکب ہو رہا ہو۔

یہ تو ہے وہ اخلاقی منہاج جو تصور خلافت سے ایک لازمی نتیجہ کے طور پر انسان کے لیے بنتی ہے۔ رہا انسان کی اخلاقی زندگی کا مقصد اور اس کی تمام سعی و عمل کا نصب العین تو وہ بھی اسی تصور سے بالکل ایک منطقی لزوم کے ساتھ متعین ہوتا ہے۔ نائب سلطان کی حیثیت سے انسان کا زمین پر مامور ہونا خود بہ خود اس بات کا مقتضی ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ خدا نے زمین کے انتظام کا جتنا حصہ انسان سے متعلق کیا ہے اُس حصہ میں خدا کے قانون کو جاری کرنا، خدا کے منشا کے مطابق امن اور عدل اور صلاح کا نظام قائم کرنا اور قائم رکھنا، اس نظام میں شر و فساد کی جو جو صورتیں شیاطین جن و انس پیدا کریں ان کو دبانا اور مٹانا، اور اُن بھلائیوں کو زیادہ سے زیادہ نشو و نما دینا جو خدا کو محبوب ہیں اور جن سے خداوندِ عالم اپنی زمین اور اپنی رعیت کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے، یہ ہے وہ مقصد جس پر ہر وہ انسان اپنی تمام مساعی کو مرکوز کر دے گا، جس کے اندر خلیفہ الٰہی ہونے کا شعور پیدا ہو چکا ہو۔ یہ مقصد

صرف یہی نہیں کہ اُن تمام مقاصد کی نفی کر دیتا ہے جو لذت پرستوں اور مادہ پرستوں اور قوم پرستوں اور دوسرے مہملات کے پرستاروں نے اپنی زندگی کے لیے مقرر کیے ہیں۔ بلکہ یہ ان لایعنی مقاصد کی بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ نفی کرتا ہے جو روحانیت کے ایک غلط تصور کے تحت اہل مذاہب نے متعین کیے ہیں۔ ان دونوں غلط انتہاؤں کے درمیان خلافتِ الٰہیہ کا تصور انسان کے سامنے ایک ایسا بلند ترین اور پاکیزہ ترین مقصدِ حیات رکھ دیتا ہے جو اس کی ساری قوتوں اور قابلیتوں کو زندگی کے ہر میدان میں برسرِ کار لاتا ہے اور انھیں ایک صالح ترین نظامِ تہذیب وتمدن کے قیام وارتقا کی خدمت میں استعمال کرتا ہے۔

یہ ہیں وہ بنیادیں جو اخلاقِ انسانی کی تعمیر کے لیے اسلام نے ہم کو دی ہیں۔ اسلام کسی ایک قوم کی جائداد نہیں بلکہ تمام انسانیت کی مشترک میراث ہے اور سارے انسانوں کی فلاح اس کے پیشِ نظر ہے۔ اس لیے ہر اُس شخص کو جو اپنی اور انسانیت کی فلاح کا خواہش مند ہو، یہ سوچنا چاہیے کہ آیا انسانی اخلاق کی تعمیر کے لیے یہ بنیادیں بہتر ہیں جو اسلام ہمیں دے رہا ہے یا وہ جو روحانی مذاہب یا فلسفیانہ مسالک ہم کو دیتے ہیں؟ اگر کسی کا دل گواہی دے کہ اخلاق کے لیے یہی بنیادیں صحیح ہیں تو پھر کوئی جاہلانہ تعصب اُسے اِن بنیادوں کے قبول کر لینے میں مانع نہ ہونا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# اسلام کا اخلاقی نظام

انسان کے اندر اخلاقی حس ایک فطری حس ہے جو بعض صفات کو پسند اور بعض دوسری صفات کو ناپسند کرتی ہے۔ یہ حس انفرادی طور پر اشخاص میں چاہے کم وبیش ہو مگر مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر برائی کا ہمیشہ یکساں حکم لگایا ہے۔ سچائی، انصاف، پاسِ عہد اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا ہے اور کبھی کوئی ایسا دور نہیں گزرا جب جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو۔ ہمدردی، رحم، فیاضی اور فراخ دلی کی ہمیشہ قدر کی گئی ہے۔ اور خود غرضی، سنگ دلی، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا۔ صبر وتحمل، استقلال، بردباری، اولوالعزمی وشجاعت ہمیشہ سے وہ اوصاف رہے ہیں جو داد کے مستحق سمجھے گئے اور بے صبری، چھچھوراپن، تلون مزاجی، پست حوصلگی اور بزدلی پر کبھی تحسین وآفریں کے پھول نہیں برسائے گئے۔ ضبطِ نفس، خودداری، شائستگی اور ملنساری کا شمار ہمیشہ سے خوبیوں میں ہوتا رہا۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بندگیِ نفس، کم ظرفی، بدتمیزی اور کج خلقی نے اخلاقی محاسن کی فہرست میں جگہ پائی ہو۔ فرض شناسی، وفاشعاری، مستعدی اور احساسِ ذمے داری کی ہمیشہ عزت کی گئی اور نافرض شناس، بے وفا، کام چور اور غیر ذمے دار کو کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ اِسی طرح اجتماعی زندگی کے اچھے اور برے اوصاف کے معاملے میں بھی انسانیت کا فیصلہ متفق علیہ ہی رہا ہے۔ قدر کی مستحق ہمیشہ وہ سوسائٹی رہی ہے جس میں نظم وانضباط ہو، تعاون اور امداد باہمی ہو، آپس کی محبت اور خیر خواہی ہو، اجتماعی انصاف اور معاشرتی مساوات ہو، تفرقہ، انتشار، بدنظمی، بے ضابطگی، نااتفاقی اور آپس کی بدخواہی، ظلم اور ناہمواری کو اجتماعی زندگی کے محاسن میں کبھی شمار نہیں کیا گیا۔ ایسا ہی معاملہ کردار کی نیکی اور بدی کا بھی ہے۔ چوری، زنا، قتل، ڈاکہ، جعل سازی اور رشوت خوری کبھی اچھے افعال نہیں سمجھے گئے۔ بدزبانی،

مردم آزاری، غیبت، چغل خوری، حسد، بہتان تراشی اور فساد انگیزی کو کبھی نیکی نہیں سمجھا گیا۔ مکار، متکبر، ریاکار، منافق، ہٹ دھرم اور حریص لوگ کبھی بھلے آدمیوں میں شمار نہیں کیے گئے۔ اس کے برعکس والدین کی خدمت، رشتے داروں کی مدد، ہمسایوں سے سلوک، دوستوں سے رفاقت، کمزوروں کی حمایت، یتیموں اور بے کسوں کی خبر گیری، مریضوں کی تیمارداری اور مصیبت زدہ لوگوں کی اعانت ہمیشہ نیکی سمجھی گئی ہے۔ پاک دامن، خوش گفتار، نرم مزاج اور خیر اندیش لوگ ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ انسانیت اپنا اچھا عنصر انہیں لوگوں کو سمجھتی رہی ہے جو راست باز اور خیر اندیش ہوں، جن پر ہر معاملے میں اعتماد کیا جا سکے، جس کا ظاہر و باطن یکساں اور قول و فعل مطابق ہو، جو اپنے حق پر قانع اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں فراخ دل ہوں، جو امن سے رہیں اور دوسروں کو امن دیں، جن کی ذات سے ہر ایک کو خیر کی امید ہو اور کسی کو برائی کا اندیشہ نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالمگیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے ہیں اور ہمیشہ سے جانتے چلے آ رہے ہیں۔ نیکی اور بدی کوئی چھپی ہوئی چیزیں نہیں ہیں کہ ان کو کہیں سے ڈھونڈ کر نکالنے کی ضرورت ہو وہ تو انسانیت کی جانی پہچانی چیزیں ہیں جن کا شعور آدمی کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنی زبان میں نیکی کو ''معروف'' اور بدی کو ''منکر'' کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی نیکی وہ چیز ہے جسے سب انسان بھلا جانتے ہیں اور منکر وہ جسے کوئی خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اسی حقیقت کو قرآن دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا یعنی نفسِ انسانی کو خدا نے بھلائی اور برائی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اخلاق کی بھلائی اور برائی جانی پہچانی چیزیں ہیں اور دنیا ہمیشہ بعض صفات کے نیک اور بعض کے بد ہونے پر متفق رہی ہے تو پھر دنیا میں یہ مختلف اخلاقی نظام کیسے ہیں؟ ان کے درمیان فرق کس بنا پر ہے؟ کیا چیز ہے جس کے باعث ہم کہتے ہیں کہ اسلام اپنا ایک مستقل اخلاقی نظام رکھتا ہے؟ اور اخلاق کے معاملے میں آخر اسلام کا وہ خاص عطیہ (Contribution) کیا ہے جسے اس کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکے؟

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے جب ہم دنیا کے مختلف اخلاقی نظاموں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پہلی نظر میں جو فرق ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف اخلاقی صفات کو زندگی کے مجموعی نظام میں سمونے، اور ان کی حد، ان کا مقام، اور ان کا مصرف تجویز کرنے اور ان کے درمیان تناسب قائم کرنے میں یہ سب

ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر زیادہ گہری نگاہ سے دیکھنے پر اس فرق کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دراصل وہ اخلاقی حسن وقبح کا معیار تجویز کرنے اور خیر وشر کے علم کا ذریعہ متعین کرنے میں مختلف ہیں اور ان کے درمیان اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ قانونِ اخلاق کے پیچھے وہ قوتِ نافذہ (Sanction) کون سی ہے جس کے زور سے وہ جاری ہو، اور وہ کیا محرکات ہیں، جو انسان کو اس قانون کی پابندی پر آمادہ کریں۔ لیکن جب ہم اس اختلاف کے اسباب کا کھوج لگاتے ہیں تو آخر کار یہ حقیقت ہم پر کھلتی ہے کہ وہ اصلی چیز جس نے ان سب اخلاقی نظاموں کے راستے الگ کر دیے ہیں، یہ ہے کہ ان کے درمیان کائنات کے تصور، کائنات کے اندر انسان کی حیثیت اور انسانی زندگی کے مقصد میں اختلاف ہے۔ اور اسی اختلاف نے جڑ سے لے کر شاخوں تک ان کی روح، ان کے مزاج اور ان کی شکل کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف کر دیا ہے، انسان کی زندگی میں اصلی فیصلہ کن سوالات یہ ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خدا ہے کہ نہیں؟ ہے تو وہ ایک ہے یا بہت سے ہیں؟ جس کی خدائی بھی مانی جائے، اس کی صفات کیا ہیں؟ ہمارے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے؟ اس نے ہماری رہنمائی کا کوئی انتظام کیا ہے یا نہیں؟ ہم اس کے سامنے جواب دہ ہیں یا نہیں؟ جواب دہ ہیں تو کس چیز کی جواب دہی ہمیں کرنی ہے؟ اور ہماری زندگی کا مقصد اور انجام کیا ہے جسے پیش نظر رکھ کر ہم کام کریں؟ ان سوالات کا جواب جس نوعیت کا ہو گا اس کے مطابق نظامِ زندگی بنے گا اور اسی کے مناسبِ حال نظامِ اخلاق تیار ہو گا۔

اِس مختصر گفتگو میں میرے لیے یہ مشکل ہے کہ دنیا کے مختلف نظام ہائے حیات کا جائزہ لے کر بتاؤں کہ ان میں سے کس کس نے ان سوالات کا کون سا جواب اختیار کیا ہے اور اس جواب نے اس کی شکل اور راستے کے تعین پر کیا اثر ڈالا ہے۔ میں صرف اسلام کے متعلق عرض کروں گا کہ وہ ان سوالات کا کیا جواب اختیار کرتا ہے اور اس کی بنا پر کس مخصوص قسم کا نظامِ اخلاق وجود میں آتا ہے۔

اسلام کا جواب یہ ہے کہ اس کائنات کا مالک خدا ہے اور وہ ایک ہی خدا ہے۔ اسی نے اسے پیدا کیا ہے۔ وہی اس کا لاشریک مالک، حاکم اور پروردگار ہے۔ اور اسی کی اطاعت پر یہ سارا نظام چل رہا ہے۔ وہ حکیم ہے، قادر مطلق ہے، کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے۔ سبوح وقدوس ہے (عیب، خطا، کمزوری اور نقص سے پاک ہے) اور اس کی خدائی ایسے طریقے پر قائم ہے جس میں لاگ لپیٹ اور ٹیڑھ نہیں ہے۔ انسان اس کا پیدائشی بندہ ہے، اس کا کام یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی اور اطاعت کرے۔ اس کی زندگی کے لیے کوئی صورت بجز اس کے صحیح نہیں ہے کہ وہ سراسر خدا کی بندگی ہو، اس

بندگی کا طریقہ تجویز کرنا انسان کا اپنا کام نہیں ہے بلکہ اس خدا کا کام ہے جس کا وہ بندہ ہے، خدا نے اس کی رہنمائی کے لیے پیغمبر بھیجے ہیں اور کتابیں نازل کی ہیں، انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کا نظام اسی سرچشمۂ ہدایت سے اخذ کرے، اِنسان اپنی زندگی کے پورے کارنامے کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اور یہ جواب دہی اسے اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں کرنی ہے۔ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی مہلت ہے اور یہاں انسان کی تمام سعی و کوشش اس مقصد پر مرکوز ہونی چاہیے کہ وہ آخرت کی جواب دہی میں اپنے خدا کے حضور کامیاب ہو، اس امتحان میں انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ شریک ہے۔ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کا امتحان ہے۔ پوری کائنات میں جس چیز سے جیسا کچھ بھی سابقہ پیش آتا ہے اس کی بے لاگ جانچ ہوتی ہے کہ انسان نے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا اور جانچ وہ ہستی کرنے والی ہے جس نے زمین کے ذروں پر، ہوا اور پانی پر، کائناتی لہروں پر اور خود انسان کے دل و دماغ اور دست و پا پر اس کی حرکات وسکنات ہی کا نہیں بلکہ اس کے خیالات اور ارادوں تک کا ٹھیک ٹھیک ریکارڈ مہیا کر رکھا ہے۔

یہ ہے وہ جواب جو اسلام نے زندگی کے بنیادی سوالات کا دیا ہے۔ یہ تصور کائنات وانسان اس اصلی اور انتہائی بھلائی کو متعین کر دیتا ہے، جس کو پہنچنا انسانی سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہیے۔ اور وہ ہے خدا کی رضا، یہی وہ معیار ہے جس پر اسلام کے اخلاقی نظام میں کسی طرزِ عمل کو پرکھ کر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ خیر ہے یا شر۔ اس کے تعین سے اخلاق کو وہ محور مل جاتا ہے، جس کے گرد پوری اخلاقی زندگی گھومتی ہے اور اس کی حالت بے لنگر کے سے جہاز کی نہیں رہتی کہ ہوا کے جھونکے اور سمندر کے تھپیڑے اسے ہر طرف دوڑاتے پھریں۔ یہ تعین ایک مرکزی مقصد سامنے رکھتا ہے جس کے لحاظ سے زندگی میں تمام اخلاقی صفات کی مناسب حدیں، مناسب جگہیں اور مناسب عملی صورتیں مقرر ہو جاتی ہیں۔ اور ہمیں وہ مستقل اخلاقی قدریں (Valuse) ہاتھ لگ جاتی ہیں جو تمام بدلے ہوئے حالات میں اپنی جگہ ثابت و قائم رہ سکیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے مقصود پا جانے سے اخلاق کو ایک بلند ترین غایت مل جاتی ہے، جس کی بدولت اخلاقی ارتقا کے امکانات لامتناہی ہو سکتے ہیں اور کسی مرحلے پر بھی اغراض پرستی کی آلائشیں اس کو ملوث نہیں کر سکتیں۔

معیار دینے کے ساتھ اسلام اپنے اسی تصور کائنات وانسان سے ہم کو اخلاقی حسن و قبح کے علم کا ایک مستقل ذریعہ بھی دیتا ہے۔ اس نے ہمارے اخلاقی علم کو محض عقل یا خواہشات یا تجربے یا علوم

انسانی پر منحصر نہیں کر دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے بدلے ہوئے فیصلوں سے ہمارے اخلاقی احکام بھی بدلتے رہیں اور انھیں کوئی پائیداری نصیب ہی نہ ہو سکے۔ بلکہ وہ ہمیں ایک متعین ماخذ دیتا ہے (یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت) جس سے ہم کو ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات ملتی ہیں اور یہ ہدایات ایسی ہیں کہ خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بڑے سے بڑے مسائل تک زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں وہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کے اندر معاملات زندگی پر اخلاق کے اصولوں کا وسیع ترین انطباق (Widestapplication) پایا جاتا ہے جو کسی مرحلے پر کسی دوسرے ذریعہ علم کی احتیاج ہمیں محسوس نہیں ہونے دیتا۔

پھر اسلام کے اسی تصور کائنات و انسان میں وہ قوتِ نافذہ (Sanction) بھی موجود ہے جس کا قانونِ اخلاق کی پشت پر ہونا ضروری ہے اور وہ ہے خدا کا خوف، آخرت کی باز پرس کا اندازہ اور ابدی مستقبل کی خرابی کا خطرہ۔ اگرچہ اسلام ایک ایسی طاقت اور رائے عام بھی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصول اخلاق کی پابندی پر مجبور کرنے والی ہو اور ایک ایسا سیاسی نظام بھی بنانا چاہتا ہے، جس کا اقتدار اخلاقی قانون کو بزور نافذ کرے لیکن اس کا اصلی اعتماد اس خارجی دباؤ پر نہیں ہے بلکہ اس اندرونی دباؤ پر ہے جو خدا اور آخرت کے عقیدے میں مضمر ہے۔ اخلاقی احکام دینے سے پہلے اسلام آدمی کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ تیرا معاملہ دراصل اس خدا کے ساتھ ہے جو ہر وقت ہر جگہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ تو دنیا بھر سے چھپ سکتا ہے مگر اس سے نہیں چھپ سکتا۔ دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے مگر اسے نہیں دے سکتا۔ دنیا بھر سے بھاگ سکتا ہے مگر اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ دنیا محض تیرے ظاہر کو دیکھتی ہے مگر وہ تیری نیتوں اور ارادوں تک کو دیکھ لیتا ہے۔ دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں تو چاہے کچھ کر لے، بہر حال تجھے ایک دن مرنا ہے اور اس عدالت میں تجھے حاضر ہونا ہے جہاں وکالت، رشوت، سفارش، جھوٹی شہادت، دھوکہ اور فریب کچھ نہ چل سکے گا اور تیرے مستقبل کا بے لاگ فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ بٹھا کر اسلام گویا ہر آدمی کے دل میں پولس کی ایک چوکی بٹھا دیتا ہے جو اندر سے اس کو احکام کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے۔ خواہ باہر ان احکام کی پابندی کرانے والی کوئی پولس، عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو۔ اسلام کے قانونِ اخلاق کی پشت پر اصل زور یہی ہے جو اسے نافذ کراتا ہے۔ رائے عام اور حکومت کی طاقت اس کی تائید میں موجود ہو تو نورٌ علیٰ نور۔ ورنہ تنہا یہی ایمان مسلمان افراد اور مسلمان قوم کو سیدھا چلا سکتا ہے بشرطیکہ واقعی ایمان دلوں میں جاگزیں ہو۔

اسلام کا یہ تصور کائنات و انسان وہ محرکات بھی فراہم کرتا ہے جو انسان کو قانونِ اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لیے ابھارتے ہیں۔ انسان کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ خدا کو اپنا خدا مانے اور اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا طریقہ بنائے اور اس کی رضا کو اپنا مقصد زندگی ٹھہرائے، یہ اس بات کے لیے کافی محرک ہے کہ وہ ان احکام کی اطاعت کرے، جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ وہ خدا کے احکام ہیں۔ اس محرک کے ساتھ آخرت کا یہ عقیدہ بھی ایک دوسرا طاقتور محرک ہے کہ جو شخص احکامِ الٰہی کی اطاعت کرے گا اس کے لیے ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے۔ خواہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی ہی مشکلات، نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے اور اس کے برعکس جو یہاں سے خدا کی نافرمانیاں کرتا ہوا جائے گا اسے ابدی سزا بھگتنی پڑے گی چاہے دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لوٹ لے۔ یہ امید اور یہ خوف اگر کسی کے دل میں جاگزیں ہو تو اس میں اتنی زبردست قوتِ محرکہ موجود ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی بدی سے دور رکھ سکتی ہے جہاں بدی نہایت پر لطف یا نفع بخش ہو۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنا ایک تصور کائنات، اپنا معیار خیر و شر، اپنا ماخذ علم اخلاق، اپنی قوتِ نافذہ، اپنی قوتِ محرکہ الگ رکھتا ہے اور انھیں چیزوں کے ذریعے سے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدر دل کے مطابق ترتیب دے کر زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرتا ہے۔ اِسی بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاقی نظام رکھتا ہے۔ اس نظام کی امتیازی خصوصیات یوں تو بہت سی ہیں مگر ان میں تین سب سے زیادہ نمایاں ہیں جنھیں اس کا خاص عطیہ کہا جا سکتا ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو مقصود بنا کر اخلاق کے لیے ایک ایسا بلند معیار فراہم کرتا ہے، جس کی وجہ سے اخلاقی ارتقاء کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ ایک ماخذِ علم مقرر کر کے اخلاق کو وہ پائیداری اور استقلال بخشتا ہے، جس میں ترقی کی گنجائش تو ہے مگر تلوّن اور نیرنگی کی گنجائش نہیں ہے۔ خوفِ خدا کے ذریعے سے اخلاق کو وہ قوتِ نافذہ دیتا ہے جو خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے اس کی پابندی کراتی ہے اور خدا و آخرت کے عقیدے سے وہ قوتِ محرکہ فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بہ خود قانونِ اخلاق پر عمل کرنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کرتی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی اُپج سے کام لے کر کچھ نرالے اخلاقیات پیش نہیں کرتا اور نہ انسان کے معروف اخلاقیات میں سے بعض کو گھٹانے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انھیں اخلاقیات کو لیتا ہے جو معروف ہیں اور ان میں سے چند کو نہیں بلکہ سب کو لیتا ہے۔ پھر زندگی میں پورے توازن اور تناسب کے ساتھ ایک کا محل، مقام اور مصرف تجویز کرتا ہے اور ان کے انطباق کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ انفرادی کردار، خانگی معاشرت، شہری زندگی، ملکی سیاست، معاشی کاروبار، منڈی، بازار، مدرسہ، عدالت، پولس لائن، چھاؤنی، میدان جنگ، صلح کانفرنس غرض زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ ایسا نہیں رہ جاتا جو اخلاق کے ہمہ گیر اثر سے بچ جائے، ہر جگہ، ہر شعبہ زندگی میں وہ اخلاق کو حکمراں بناتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ معاملاتِ زندگی کی باگیں خواہشات، اغراض اور مصلحتوں کے بجائے اخلاق کے ہاتھ میں ہوں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت سے ایک ایسے نظامِ زندگی کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف پر قائم اور منکر سے پاک ہو۔ اس کی دعوت یہی ہے کہ جن بھلائیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے، آؤ انھیں قائم کریں اور پروان چڑھائیں اور جن برائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی رہی ہے آؤ انھیں دبائیں اور مٹائیں۔ اس دعوت پر جنھوں نے لبیک کہا انھیں کو جمع کر کے اسلام نے ایک امت بنائی، جس کا نام مسلم تھا اور ان کو ایک اُمت بنانے سے اس کی واحد غرض یہی تھی کہ وہ معروف کو جاری اور قائم کرنے، اور منکر کو دبانے اور مٹانے کے لیے منظّم سعی کریں۔ اب اگر اسی امت کے ہاتھوں معروف دبے اور منکر قائم ہونے لگے تو یہ ماتم کی جگہ ہے خود اس امت کے لیے بھی اور دنیا کے لیے بھی۔

# اسلام کا معاشرتی نظام

اسلام کے معاشرتی نظام کا سنگِ بنیاد یہ نظریہ ہے کہ دنیا کے سب انسان ایک نسل سے ہیں۔ خدا نے سب سے پہلے ایک انسانی جوڑا پیدا کیا تھا۔ پھر اسی جوڑے سے وہ سارے لوگ پیدا ہوئے جو دنیا میں آباد ہیں۔ ابتدا میں ایک مدت تک اس جوڑے کی اولاد ایک ہی اُمت بنی رہی۔ ایک ہی اس کا دین تھا، ایک ہی اس کی زبان تھی، کوئی اختلاف اس کے درمیان نہ تھا، مگر جوں جوں ان کی تعداد بڑھتی گئی وہ زمین پر پھیلتے چلے گئے، اور اس پھیلاؤ کی وجہ سے قدرتی طور پر مختلف نسلوں، قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان کی زبانیں الگ ہو گئیں، ان کے لباس الگ ہو گئے۔ رہن سہن کے طریقے الگ ہو گئے۔ اور جگہ جگہ کی آب و ہوا نے ان کے رنگ روپ اور خدو خال تک بدل دیے۔ یہ سب اختلافات فطری اختلافات ہیں، واقعات کی دنیا میں موجود ہیں۔ اس لیے اسلام ان کو بطور ایک واقعہ کے تسلیم کرتا ہے وہ ان کو مٹانا نہیں چاہتا۔ بلکہ ان کا یہ فائدہ مانتا ہے کہ انسانوں کا باہمی تعارف اور تعاون اسی صورت سے ممکن ہے۔ لیکن ان اختلافات کی بنا پر انسانوں میں رنگ، زبان، قومیت اور وطنیت کے جو تعصبات پیدا ہو گئے ہیں ان سب کو اسلام غلط قرار دیتا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان اونچ نیچ، شریف اور کمین، اپنے اور غیر کے جتنے فرق پیدائش کی بنیاد پر کر لیے گئے ہیں اسلام کے نزدیک یہ سب جاہلیت کی باتیں ہیں۔ وہ تمام دنیا کے انسانوں سے کہتا ہے کہ تم سب ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہو۔ لہٰذا ایک دوسرے کے بھائی ہو، اور انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہو۔

انسانیت کا یہ تصور اختیار کرنے کے بعد اسلام کہتا ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان اصلی فرق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ رنگ، نسل، وطن اور زبان کا نہیں بلکہ خیالات، اخلاق اور اصولوں کا ہو سکتا ہے۔ ایک ماں کے دو بچے اپنے نسب کے لحاظ سے چاہے ایک ہوں لیکن اگر ان کے خیالات اور اخلاق

ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو زندگی میں دونوں کی راہیں الگ ہوجائیں گی۔ اس کے برعکس مشرق اور مغرب کے انتہائی فاصلے پر رہنے والے دو انسان اگرچہ ظاہر میں کتنے ہی ایک دوسرے سے دور ہوں لیکن اگر خیالات میں متفق ہیں اور اخلاق ملتے جلتے ہیں تو ان کی زندگی کا راستہ ایک ہوگا۔ اس نظریے کی بنیاد پر اسلام دنیا کے تمام نسلی، وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس ایک فکری، اخلاقی اور اصولی معاشرہ تعمیر کرتا ہے، جس میں انسان اور انسان کے ملنے کی بنیاد اس کی پیدائش نہیں بلکہ ایک عقیدہ اور ایک اخلاقی ضابطہ ہے۔ ہر وہ شخص جو خدا کو اپنا مالک و معبود مانے اور پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کو اپنا قانونِ زندگی تسلیم کرے، اس معاشرے میں شامل ہوسکتا ہے خواہ وہ افریقہ کا رہنے والا ہو یا امریکہ کا، خواہ وہ سامی نسل کا ہو یا آریہ نسل کا، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، خواہ وہ ہندی بولتا ہو یا عربی جو انسان بھی اس معاشرے میں شامل ہوں گے ان سب کے حقوق اور معاشرتی مرتبے یکساں ہوں گے۔ کسی قسم کی نسلی، قومی یا طبقاتی امتیازات ان کے درمیان نہ ہوں گے۔ کوئی اونچا یا نیچا نہ ہوگا، کوئی چھوت چھات ان میں نہ ہوگی، کسی کا ہاتھ لگنے سے کوئی ناپاک نہ ہوگا۔

شادی بیاہ اور کھانے پینے اور مجلسی میل جول میں ان کے درمیان کسی قسم کی رکاوٹیں نہ ہوں گی۔ کوئی اپنی پیدائش اور پیشے کے لحاظ سے ذلیل یا کمین نہ ہوگا۔ کسی کو اپنی ذات برادری یا حسب ونسب کی بنا پر کوئی مخصوص حقوق حاصل نہ ہوسکیں گے۔ آدمی کی بزرگی اس کے خاندان یا اس کے مال کی وجہ سے نہ ہوگی بلکہ صرف اس وجہ سے ہوگی کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں اور وہ خدا ترسی میں دوسروں سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

یہ ایسا معاشرہ ہے جو نسل، رنگ اور زبان کی حد بندیوں اور جغرافی سرحدوں کو توڑ کر روئے زمین کے تمام خطوں پر پھیل سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر انسانوں کی ایک عالم گیر برادری قائم ہوسکتی ہے۔ نسلی اور وطنی معاشروں میں تو صرف وہ لوگ شامل ہوسکتے ہیں جو کسی نسل یا وطن میں پیدا ہوئے ہوں۔ اس سے باہر کے لوگوں پر ہر ایسے معاشرے کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ مگر اس فکری اور اصولی معاشرے میں ہر وہ شخص برابر کے حقوق کے ساتھ شامل ہوسکتا ہے جو ایک عقیدے اور ایک اخلاقی ضابطے کو تسلیم کرے۔ رہے وہ لوگ جو اس عقیدے اور ضابطے کو نہ مانیں تو یہ معاشرہ انھیں اپنے دائرے میں نہیں لیتا مگر انسانی برادری کا تعلق ان کے ساتھ قائم کرنے اور انسانیت کے حقوق انھیں دینے کے لیے تیار ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ماں کے دو بچے خیالات میں مختلف ہیں تو ان کے طریقِ زندگی بہر حال مختلف ہوں گی۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے بھائی نہیں رہے۔ بالکل اسی طرح نسل انسانی کے دو گروہ بھی اگر عقیدے اور اصول میں اختلاف رکھتے ہیں تو ان کے معاشرے یقیناً الگ ہوں گے۔ مگر انسانیت بہر حال ان میں مشترک رہے گی۔ اِس مشترک انسانیت کی بنا پر زیادہ سے زیادہ جن حقوق کا تصور کیا جاسکتا ہے وہ سب اسلامی معاشرے نے غیر اسلامی معاشروں کے لیے تسلیم کیے ہیں۔

اسلامی نظامِ معاشرت کی ان بنیادوں کو سمجھ لینے کے بعد آیئے اب ہم دیکھیں کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے انسانی میل ملاپ کی مختلف صورتوں کے لیے مقرر کیے ہیں۔

انسانی معاشرت کا اولین اور بنیادی ادارہ خاندان ہے۔ خاندان کی بنا ایک مرد اور ایک عورت کے ملنے سے پڑتی ہے۔ اس میل ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے۔ پھر اس سے رشتے اور کنبے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر یہی چیز پھیلتے پھیلتے ایک معاشرے تک پہنچتی ہے۔ پھر خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لیے نہایت محبت، ایثار، دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے۔ یہ ادارہ تمدنِ انسانی کی بقا کے لیے اور نشو ونما کے لیے صرف رنگروٹ ہی بھرتی نہیں کرتا بلکہ اس کے کارکن دل سے اِس بات کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کی جگہ لینے والے خود اُن سے بہتر ہوں۔ اِس بنا پر یہ ایک حقیقت ہے کہ خاندان ہی انسانی تمدن کی جڑ ہے اور اس جڑ کی صحت و طاقت پر خود تمدن کی صحت و طاقت کا مدار ہے۔ اس لیے اسلام معاشرتی مسائل میں سب سے پہلے اس امر کی طرف توجہ کرتا ہے کہ خاندان کے ادارے کو صحیح ترین اور مضبوط ترین بنیادوں پر قائم کیا جائے۔

اسلام کے نزدیک مرد اور عورت کے تعلق کی صورت صرف وہ ہے جس کے ساتھ معاشرتی ذمے داریاں قبول کی گئی ہوں اور جس کے نتیجہ میں ایک خاندان کی بنا پڑے۔ آزادانہ اور غیر ذمے دارانہ تعلق کو وہ محض ایک معصوم سی تفریح یا ایک معمولی سی بے راہ روی سمجھ کر ٹال نہیں دیتا بلکہ اس کی نگاہ میں یہ انسانی تمدن کی جڑ کاٹ دینے والا فعل ہے اس لیے ایسے تعلق کو وہ حرام اور قانونی جرم قرار دیتا ہے، اس کے لیے سخت سزا تجویز کرتا ہے تاکہ سوسائٹی میں ایسے تمدن کش تعلقات رائج نہ ہونے پائیں اور معاشرت کو ان اسباب سے پاک کر دینا چاہتا ہے جو غیر ذمے دارانہ تعلق کے لیے محرک ہوتے ہوں یا اس کے لیے مواقع پیدا کرتے ہوں۔ پردے کے احکام، مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول کی ممانعت، موسیقی اور تصاویر پر پابندی، فواحش کی اشاعت کے لیے رکاوٹیں، سب اسی چیز کی روک تھام

کے لیے ہیں اور ان کا مرکزی مقصد خاندان کے ادارے کو محفوظ اور مضبوط کرنا ہے۔ دوسری طرف ذمے دارانہ تعلق یعنی نکاح کو اسلام محض جائز ہی نہیں بلکہ اسے ایک نیکی، کارثواب اور عبادت قرار دیتا ہے۔ سن بلوغ کے بعد مرد اور عورت کے مجرد رہنے کو ناپسند کرتا ہے۔ ہر نوجوان کو اس پر اکساتا ہے کہ تمدن کی جن ذمے داریوں کا بار اس کے ماں باپ نے اُٹھایا تھا اپنی باری آنے پر وہ بھی انھیں اُٹھائے۔ اسلام رہبانیت کو نیکی نہیں سمجھتا بلکہ اسے فطرت اللہ کے خلاف ایک بدعت ٹھہراتا ہے۔ وہ ان تمام رسموں اور رواجوں کو بھی ناپسند کرتا ہے، جن کی وجہ سے نکاح ایک مشکل اور بھاری کام بن جاتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ معاشرے میں نکاح کو آسان ترین فعل ہونا چاہیے نہ کہ نکاح مشکل اور زنا آسان ہو۔ اسی لیے اس نے چند مخصوص رشتوں کو حرام ٹھہرانے کے بعد تمام دور و نزدیک کے رشتہ داروں میں ازدواجی تعلق کو جائز کر دیا ہے۔ ذات برادری کی تفریقیں اڑا کر تمام مسلمانوں میں آپس کے شادی بیاہ کی کھلی اجازت دے دی ہے۔ مہر اور جہیز اس قدر ہلکے رکھنے کا حکم دیا ہے جنھیں فریقین بہ آسانی برداشت کر سکیں اور رسمِ نکاح ادا کرنے کے لیے کسی قاضی، پنڈت پروہت یا دفتر و رجسٹر کی کوئی ضرورت نہیں رکھی۔ اسلامی معاشرے کا نکاح ایک ایسی سادہ سی رسم ہے جو ہر کہیں دو گواہوں کے سامنے بالغ زوجین کے ایجاب وقبول سے انجام پا سکتی ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ یہ ایجاب وقبول خفیہ نہ ہو بلکہ بستی میں اعلان کے ساتھ ہو۔

خاندان کے اندر اسلام نے مرد کو ناظم کی حیثیت دی ہے تاکہ وہ اپنے گھر میں نظم وضبط قائم رکھے۔ بیوی کو شوہر کی اور اولاد کو ماں اور باپ دونوں کی اطاعت وخدمت کا حکم دیا ہے۔ ایسے ڈھیلے ڈھالے نظامِ خاندانی کو اسلام پسند نہیں کرتا جس میں کوئی انضباط نہ ہو اور گھر والوں کے اخلاق و معاملات درست رکھنے کا کوئی بھی ذمے دار نہ ہو۔ نظم بہرحال ایک ذمے دار ناظم ہی سے قائم ہو سکتا ہے اور اسلام کے نزدیک اس ذمے داری کے لیے خاندان کا باپ ہی فطرتاً موزوں ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مرد کو گھر کا ایک جابر و قاہر حکم راں بنایا گیا ہے اور عورت ایک بے بس لونڈی کی حیثیت سے اس کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اسلام کے نزدیک ازدواجی زندگی کی اصل روح محبت و رحمت ہے۔ عورت کا فرض اگر شوہر کی اطاعت ہے تو مرد کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے اختیارات کو اصلاح کے لیے استعمال کرے نہ کہ زیادتی کے لیے۔ اسلام ایک ازدواجی تعلق کو اسی وقت تک باقی رکھنا چاہتا ہے جب تک اس میں محبت کی شیرینی یا کم از کم رفاقت کا امکان باقی ہو۔ جہاں یہ امکان باقی نہ رہے وہاں وہ

مرد کو طلاق اور عورت کو خلع کا حکم دیتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں اسلامی عدالت کو یہ اختیارات عطا کرتا ہے کہ وہ ایسے نکاح کو توڑ دے جو رحمت کے بجائے زحمت بن گیا ہے۔

خاندان کے محدود دائرے سے باہر قریب ترین سرحد رشتے داری کی ہے، جس کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ جو لوگ ماں باپ کے تعلق سے یا بھائی اور بہنوں کے تعلق سے یا سسرالی تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں اسلام ان سب کو ایک دوسرے کا ہمدرد، مددگار اور غم گسار دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ "ذوی القربیٰ" یعنی رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں صلہ رحمی کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے۔ وہ شخص اسلام کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ ہے جو اپنے رشتہ داروں سے سرد مہری اور طوطا چشمی کا معاملہ کرے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ رشتہ داروں کی بیجا طرف داری کوئی اسلامی کام ہے۔ اپنے کنبے قبیلے کی ایسی حمایت جو حق کے خلاف ہو، اسلام کے نزدیک جاہلیت ہے۔ اسی طرح اگر حکومت کا کوئی افسر پبلک کے خرچ پر اقربا پروری کرنے لگے یا اپنے فیصلوں میں اپنے عزیزوں کے ساتھ بیجا رعایت کرنے لگے تو یہ بھی کوئی اسلامی کام نہیں ہے بلکہ ایک شیطانی حرکت ہے۔ اسلام جس صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے وہ اپنی ذات سے ہونی چاہیے اور حق و انصاف کی حد کے اندر ہونی چاہیے۔

رشتے داری کے تعلق کے بعد دوسرا قریب ترین تعلق ہمسائے گی کا ہے۔ قرآن کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رشتہ دار ہمسایہ، دوسرا اجنبی ہمسایہ اور تیسرا وہ عارضی ہمسایہ جس کے پاس بیٹھنے یا چلنے کا آدمی کو اتفاق ہو۔ یہ سب اسلامی احکام کی رو سے رفاقت، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے ہمسایے کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی ہے کہ میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اسے وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "وہ شخص مومن نہیں ہے، جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو۔" ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے۔" ایک مرتبہ آں حضرتؐ سے عرض کیا گیا کہ ایک عورت بہت نمازیں پڑھتی ہے، اکثر روزے رکھتی ہے، خوب خیرات کرتی ہے مگر اس کی بد زبانی سے پڑوسی عاجز ہیں، آپ نے فرمایا "وہ دوزخی ہے۔" لوگوں نے عرض کیا کہ ایک دوسری عورت ہے جس میں یہ خوبیاں تو نہیں ہیں مگر وہ پڑوسیوں کو تکلیف بھی نہیں دیتی۔ فرمایا "وہ جنتی ہے۔" آں حضرتؐ نے لوگوں کو یہاں تک تاکید فرمائی تھی کہ اپنے بچوں کے لیے اگر پھل لاؤ تو یا تو

ہمسایہ کے گھر بھی بھیجو ورنہ چھلکے باہر نہ پھینکو تاکہ غریب ہمسایہ کا دل نہ دکھے۔" ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تیرے ہمسایے تجھے اچھا کہتے ہیں تو واقعی تو اچھا ہے اور اگر ہمسایے کی رائے تیرے بارے میں خراب ہے تو تو برا آدمی ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام ان سب لوگوں کو جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں، آپس میں ہمدرد، مددگار اور شریک رنج و راحت دیکھنا چاہتا ہے۔ ان سب کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے پر بھروسا کریں اور ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان و مال اور آبرو کو محفوظ سمجھیں۔ رہی وہ معاشرت جس میں ایک دیوار بیچ رہنے والے دو آدمی برسوں سے ایک دوسرے سے ناآشنا رہیں اور جس میں ایک محلے کے رہنے والے باہم کوئی دلچسپی، کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ رکھتے ہوں تو ایسی معاشرت ہرگز اسلامی معاشرت نہیں ہو سکتی۔

اِن قریبی رابطوں کے بعد تعلقات کا وہ وسیع دائرہ سامنے آتا ہے جو پورے معاشرے پر پھیلا ہے۔ اس دائرے میں اسلام ہماری اجتماعی زندگی کو جن بڑے بڑے اصولوں پر قائم کرتا ہے وہ مختصراً یہ ہیں:

۱- نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو اور بدی اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔ (المائدہ:۲)

۲- تمھاری دوستی اور دشمنی خدا کی خاطر ہونی چاہیے، جو کچھ دو اس لیے دو کہ خدا اس کا دینا پسند کرتا ہے اور جو کچھ روکو اس لیے روکو کہ خدا کو اس کا دینا پسند نہیں ہے۔ (حدیث)

۳- تم وہ بہترین امت ہو جسے دنیا والوں کی بھلائی کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ تمھارا کام نیکی کا حکم دینا اور بدی کو روکنا ہے۔ (آل عمران:۱۱۰)

۴- آپس میں بدگمانی نہ کرو، ایک دوسرے کے معاملات کا تجسس نہ کرو، ایک کے خلاف دوسرے کو نہ اکساؤ، آپس کے حسد اور بغض سے بچو، ایک دوسرے کی کاٹ میں نہ پڑو، اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بن کر رہو۔ (حدیث)

۵- کسی کو ظالم جانتے ہوئے اس کا ساتھ نہ دو۔ (حدیث)

۶- غیر حق میں اپنی قوم کی حمایت کرنا ایسا ہے جیسے تمھارا اونٹ کنوئیں میں گرنے لگا تو تم بھی اس کی دم پکڑ کر اس کے ساتھ جا گرے۔ (حدیث)

۷- دوسروں کے لیے وہی کچھ پسند کرو جو تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ (حدیث)

## تمدّن کی تخلیق میں صنفی کشش کا اثر

یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ کیا محض بقائے نوع کے لیے؟ نہیں۔ کیوں کہ نوعِ انسانی کو باقی رکھنے کے لیے اس قدر تناسل کی بھی ضرورت نہیں ہے، جس قدر مچھلی اور بکری اور ایسی ہی دوسری انواع کے لیے ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ فطرت نے ان سب انواع سے زیادہ صنفی میلان انسان میں رکھا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ اسبابِ تحریک فراہم کیے ہیں؟ کیا یہ محض

انسان کے لطف اور لذت کے لیے ہے؟ یہ بھی نہیں۔ فطرت نے کہیں بھی لطف اور لذت کو مقصود بالذات نہیں بنایا ہے۔ وہ تو کسی بڑے مقصد کی خدمت پر انسان اور حیوان کو مجبور کرنے کے لیے لطف اور لذت کو محض چاشنی کے طور پر لگا دیتی ہے تاکہ وہ اس خدمت کو غیر کا نہیں بلکہ اپنا کام سمجھ کر انجام دیں۔

اب غور کیجیے کہ اس معاملے میں کون سا بڑا مقصد فطرت کے پیشِ نظر ہے؟ آپ جتنا غور کریں گے کوئی اور وجہ اس کے سوا سمجھ میں نہ آئے گی کہ فطرت، دوسری تمام انواع کے بخلاف نوعِ انسانی کو متمدن بنانا چاہتی ہے۔

اسی لیے انسان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا وہ داعیہ رکھا گیا ہے جو محض جسمانی اتصال اور فعلِ تناسل ہی کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ ایک دائمی معیت اور قلبی وابستگی اور روحانی لگاؤ کا مطالبہ کرتا ہے۔

اسی لیے انسان میں صنفی میلان اس کی واقعی قوتِ مباشرت سے بہت زیادہ رکھا گیا ہے۔ اس میں جتنی صنفی خواہش اور صنفی کشش رکھی گئی ہے اگر اسی نسبت سے، بلکہ ایک اور دس کی نسبت سے بھی وہ فعل تناسل کا ارتکاب کرے تو اس کی صحت جواب دے دے، اور عمرِ طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہی اس کی جسمانی قوتیں ختم ہو جائیں۔ یہ بات اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ انسان میں صنفی کشش کی زیادتی کا ہونا اس لیے نہیں ہے کہ وہ تمام حیوانات سے بڑھ کر صنفی عمل کرے، بلکہ اس سے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنا اور اُن کے باہمی تعلق میں استمرار و استقلال پیدا کرنا ہے۔

اسی لیے عورت کی فطرت میں صنفی کشش اور صنفی خواہش کے ساتھ ساتھ شرم و حیا اور تمانع اور فرار اور رکاوٹ کا مادہ رکھا گیا ہے جو کم و بیش ہر عورت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرار اور منع کی کیفیت اگرچہ دوسرے حیوانات کے اناث میں بھی نظر آتی ہے مگر انسان کی صنفِ اناث میں اس کی قوت و کمیت بہت زیادہ ہے۔ اور اس کو جذبۂ شرم و حیا کے ذریعے سے اور زیادہ شدید کر دیا گیا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں صنفی مقناطیسیت کا مقصد ایک مستقل وابستگی ہے، نہ یہ کہ ہر صنفی کشش ایک صنفی عمل پر منتج ہو۔

اسی لیے انسان کے بچے کو تمام حیوانات کے بچوں سے زیادہ کمزور اور بے بس پیدا کیا گیا ہے۔ بخلاف دوسرے حیوانات کے، انسان کا بچہ کئی سال تک ماں باپ کی حفاظت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے اور اس میں اپنے آپ کو سنبھالنے اور اپنی مدد آپ کرنے کی قابلیت بہت دیر میں پیدا ہوتی ہے، اس سے بھی یہ مقصود ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق محض تعلقِ صنفی کی حد تک نہ رہے بلکہ اس تعلق کا نتیجہ ان کو باہمی ارتباط و تعاون پر مجبور کردے۔

اسی لیے انسان کے دل میں اولاد کی محبت تمام حیوانات سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ حیوانات ایک قلیل مدت تک اپنے بچوں کی پرورش کرنے کے بعد اُن سے الگ ہو جاتے ہیں پھر ان میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، بلکہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں۔ بخلاف اس کے انسان ابتدائی پرورش کا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی اولاد کی محبت میں گرفتار رہتا ہے، حتیٰ کہ یہ محبت اولاد کی اولاد تک منتقل ہوتی ہے، اور انسان کی خود غرض حیوانیت اس محبت کے اثر سے اس درجہ مغلوب ہو جاتی ہے کہ وہ جو کچھ اپنی ذات کے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ اپنی اولاد کے لیے چاہتا ہے۔ اور اس کے دل میں اندر سے یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ اپنی حدِ امکان تک اولاد کے لیے بہتر سے بہتر اسبابِ زندگی بہم پہنچائے اور اپنی محنتوں کے نتائج اُن کے لیے چھوڑ جائے۔ اس شدید جذبۂ محبت کی تخلیق سے فطرت کا مقصد صرف یہی ہوسکتا ہے کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق کو ایک دائمی رابطے میں تبدیل کردے۔ پھر اس دائمی رابطے کو ایک خاندان کی ترکیب کا ذریعہ بنائے، پھر خونی رشتوں کی محبت کا سلسلہ بہت سے خاندانوں کو مصاہرت کے تعلق سے مربوط کرتا چلا جائے پھر محبتوں اور محبوبوں کا اشتراک اُن کے درمیان تعاون اور معاملت کا تعلق پیدا کردے اور اس طرح ایک معاشرہ اور ایک نظامِ تمدّن وجود میں آجائے۔

## تمدن کا بنیادی مسئلہ

اس سے معلوم ہوا کہ یہ صنفی میلان جو انسانی جسم کے ریشے ریشے اور اس کے قلب و روح کے گوشے گوشے میں رکھا گیا ہے، اور جس کی مدد کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر کائنات کے چپے چپے میں اسباب و محرکات فراہم کیے گئے ہیں۔ اس کا مقصد انسان کی انفرادیت کو اجتماعیت کی

طرف مائل کرنا ہے۔ فطرت نے اس میلان کو تمدّنِ انسانی کی اصل قوتِ محرکہ بنایا ہے۔ اسی میلان و کشش کے ذریعے سے نوعِ انسانی کی دو صنفوں میں وابستگی پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر اس وابستگی سے اجتماعی زندگی (Social Life) کا آغاز ہوتا ہے۔

جب یہ امر محقق ہو گیا، تو یہ بات بھی آپ سے آپ ظاہر ہو گئی کہ عورت اور مرد کے تعلق کا مسئلہ دراصل تمدّن کا بنیادی مسئلہ ہے اور اسی کے صحیح حل پر تمدن کی صلاح و فساد اور اس کی بہتری و بدتری اور اس کے استحکام وضعف کا انحصار ہے۔ نوعِ انسانی کے اِن دونوں حصوں میں ایک تعلق حیوانی (یا بالفاظِ دیگر خالص صنفی اور سراسر شہوانی) ہے جس کا مقصود بقائے نوع کے سوا کچھ نہیں۔ اور دوسرا تعلق انسانی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں مل کر مشترک اغراض کے لیے اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق تعاون کریں۔ اس تعاون کے لیے ان کی صنفی محبت ایک واسطۂ اتصال کے طور پر کام دیتی ہے، اور یہ حیوانی و انسانی عناصر دونوں مل کر بیک وقت اُن سے تمدّن کا کاروبار چلانے کی خدمت بھی لیتے ہیں۔ اور اس کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے مزید افراد فراہم کرنے کی خدمت بھی۔ تمدّن کی صلاح و فساد کا مدار اس پر ہے کہ ان دونوں عناصر کا امتزاج نہایت متناسب اور معتدل ہو۔

## مدنیّتِ صالحہ کے لوازم

آیئے اب ہم اس مسئلے کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کریں کہ ایک صالح تمدّن کے لیے عورت اور مرد کے حیوانی اور انسانی تعلق میں معتدل اور متناسب امتزاج کی صورت کیا ہے اور اس امتزاج پر بے اعتدالی کی کن کن صورتوں کے عارض ہونے سے تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔

## ۱۔ میلان صنفی کی تعدیل

سب سے اہم اور مقدم سوال خود اس صنفی کشش اور میلان کا ہے کہ اس کو کس طرح قابو میں رکھا جائے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان کے اندر یہ میلان تمام حیوانات سے زیادہ طاقت ور ہے۔ نہ صرف یہ کہ انسانی جسم کے اندر صنفی تحریک پیدا کرنے والی قوتیں زیادہ شدید

ہیں بلکہ باہر بھی اس وسیع کائنات میں ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ چیز جس کے لیے فطرت نے خود ہی اتنے انتظامات کر رکھے ہیں۔ اگر انسان بھی اپنی توجہ اور قوتِ ایجاد سے کام لے کر اس کو بڑھانے اور ترقی دینے کے اسباب مہیا کرنے لگے اور ایسا طرزِ تمدّن اختیار کرے جس میں اس کی صنفی پیاس بڑھتی چلی جائے، اور پھر اس پیاس کو بجھانے کی آسانیاں بھی پیدا کی جاتی رہیں، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ حدِ مطلوب سے بہت زیادہ متجاوز ہو جائے گی۔ انسان کا حیوانی عنصر اس کے انسانی عنصر پر پوری طرح غالب ہو جائے گا۔ اور یہ حیوانیت اس کی انسانیت اور اس کے تمدّن دونوں کو کھا جائے گی۔

صنفی تعلق اور اس کے مبادی اور محرکات میں سے ایک ایک چیز کو فطرت نے لذیذ بنایا ہے مگر جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، فطرت نے یہ لذت کی چاٹ محض اپنے مقصد یعنی تعمیر تمدن کے لیے لگائی ہے۔ اس چاٹ کا حد سے بڑھ جانا اور اسی میں انسان کا منہمک ہو جانا نہ صرف تمدن بلکہ خود انسان کی بھی تخریب و ہلاکت کا موجب ہو سکتا ہے، ہو رہا ہے اور بار ہا ہو چکا ہے۔ جو قومیں تباہ ہو چکی ہیں ان کے آثار اور ان کی تاریخ کو دیکھیے، شہوانیت اُن میں حد سے متجاوز ہو چکی تھی۔ ان کے لٹریچر اسی قسم کے ہیجان انگیز مضامین سے لبریز پائے جاتے ہیں۔ اُن کے تخیلات، ان کے افسانے، ان کے اشعار، ان کی تصویریں، ان کے مجسّمے، ان کے عبادت خانے، ان کے محلات، سب کے سب اس پر شاہد ہیں۔ جو قومیں اب تباہی کی طرف جا رہی ہیں ان کے حالات بھی دیکھ لیجیے۔ وہ اپنی شہوانیت کو آرٹ اور ادبِ لطیف اور ذوقِ جمال اور ایسے کتنے ہی خوشنما اور معصوم ناموں سے موسوم کر لیں، مگر تعبیر کے بدل جانے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ یہ کیا چیز ہے کہ سوسائٹی میں عورت کو عورتوں سے زیادہ مرد کی صحبت اور مرد کو مردوں سے زیادہ عورتوں کی معیت مرغوب ہے؟ یہ کیوں ہے کہ عورتوں اور مردوں میں تزئین و آرائش کا ذوق بڑھتا چلا جا رہا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ مخلوط سوسائٹی میں عورت کا جسم لباس سے باہر نکلا پڑتا ہے؟ وہ کون سی شے ہے جس کے سبب سے عورت اپنے جسم کے ایک ایک حصے کو کھول کھول کر پیش کر رہی ہے اور مردوں کی طرف سے هَلْ مِنْ مَّزِيْد کا تقاضا ہے؟ اس کی کیا علت ہے کہ برہنہ تصویریں، ننگے مجسمے اور عریاں ناچ سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں؟ اس کا کیا سبب ہے

کہ سینما میں اس وقت تک لطف ہی نہیں آتا جب تک عشق و محبت کی چاشنی نہ ہو اور اس پر صنفی تعلقات کے بہت سے قولی اور فعلی مبادی کا اضافہ نہ کیا جائے؟

یہ اور ایسے ہی بہت سے مظاہر اگر شہوانیت کے مظاہر نہیں تو کس چیز کے ہیں؟ جس تمدن میں ایسا غیر معتدل شہوانی ماحول پیدا ہو جائے اس کا انجام تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایسے ماحول میں صنفی میلان کی شدت اور پیہم ہیجان اور مسلسل تحریک کی وجہ سے ناگزیر ہے کہ نسلیں کمزور ہو جائیں، جسمانی اور عقلی قوتوں کا نشو و نما بگڑ جائے، قوائے ذہنی پراگندہ ہو جائیں[1] فواحش کی کثرت ہو، امراضِ خبیثہ کی وبائیں پھیلیں۔ منعِ حمل اور اسقاطِ حمل اور قتلِ اطفال جیسی تحریکیں وجود میں آئیں، مرد اور عورت بہائم کی طرح ملنے لگیں، بلکہ فطرت نے ان کے اندر جو صنفی میلان تمام حیوانات سے بڑھ کر رکھا ہے، اس کو وہ مقاصدِ فطرت کے خلاف استعمال کریں اور اپنی بہیمیت میں تمام حیوانات سے بازی لے جائیں، حتیٰ کہ بندروں اور بکروں کو بھی مات کر دیں۔ لامحالہ ایسی شدید حیوانیت انسانی تمدن و تہذیب بلکہ خود انسانیت کو بھی غارت کر دے گی، اور جو لوگ اس میں مبتلا ہوں گے اُن کا اخلاقی انحطاط اُن کو ایسی پستی میں گرائے گا جہاں سے وہ پھر کبھی نہ اٹھ سکیں گے۔

---

[1] ایک ڈاکٹر لکھتا ہے: بلوغ کے آغاز کا زمانہ بڑے اہم تغیرات کے ساتھ آتا ہے۔ نفس اور جسم کے مختلف افعال میں اس وقت ایک انقلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور تمام حیثیتوں سے عام نشو و نما ہوتا ہے۔ آدمی کو اس وقت ان تغیرات کو برداشت کرنے اور اس نشو و نما کو حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام قوت درکار ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بیماریوں کے مقابلے کی طاقت اس زمانے میں آدمی کے اندر بہت کم ہوتی ہے۔ عام نشو و نما، اعضا کی ترقی اور نفسی و جسمانی تغیرات کا یہ طویل عمل جس کے بعد آدمی بچے سے جوان بنتا ہے، ایک ایسا تھکا دینے والا عمل ہے جس کے دوران میں طبیعت انتہائی جد و جہد میں مصروف ہوتی ہے۔ اس حالت میں اس پر کوئی غیر معمولی بار ڈالنا جائز نہیں۔ خصوصاً صنفی عمل اور شہوانی ہیجان تو اس کے لیے تباہ کن ہے۔

ایک اور مشہور جرمن عالمِ نفسیات و عمرانیات لکھتا ہے۔ ''صنفی اعضا کا تعلق چونکہ لذت اور جوش کے غیر معمولی ہیجانات (Sensations) کے ساتھ ہے۔ اس وجہ سے یہ اعضاء ہماری ذہنی قوتوں میں سے ایک بڑا حصہ اپنی طرف جذب کر لینے یا بالفاظ دیگر ان پر ڈاکہ مار دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اگر انہیں غلبہ حاصل ہو جائے تو یہ آدمی کو تمدن کی خدمت کے بجائے انفرادی لطف اندوزی میں منہمک کر دیں۔ یہ طاقتور پوزیشن جو اُن کو جسمِ انسانی میں حاصل ہے، آدمی کی صنفی زندگی کو ذرا سی غفلت میں حالت اعتدال سے بے اعتدالی کی طرف لے جا کر مفید سے مضر بنا سکتی ہے۔ تعلیم کا اہم ترین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس خطرے کی روک تھام کی جائے۔''

ایسا ہی انجام اس تمدن کا بھی ہوگا جو تفریط کا پہلو اختیار کرے گا۔ جس طرح صنفی میلان کا حدِ اعتدال سے بڑھ جانا مضر ہے۔ اسی طرح اس کو حد سے زیادہ دبانا اور کچل دینا بھی مضر ہے۔ جو نظامِ تمدّن انسان کو سنیاس اور برہمچریہ اور رہبانیت کی طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ فطرت سے لڑتا ہے اور فطرت اپنے مدمقابل سے کبھی شکست نہیں کھاتی بلکہ خود اسی کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ خالص رہبانیت کا تصور تو ظاہر ہے کہ کسی تمدن کی بنیاد بن ہی نہیں سکتا، کیونکہ وہ دراصل تمدن و تہذیب کی نفی ہے۔ البتہ راہبانہ تصورات کو دلوں میں راسخ کر کے نظامِ تمدّن میں ایک ایسا غیر صنفی ماحول ضرور پیدا کیا جاسکتا ہے، جس میں صنفی تعلق کو بذاتِ خود ایک ذلیل، قابل نفرت اور گھناؤنی چیز سمجھا جائے، اس سے پرہیز کرنے کو معیارِ اخلاق قرار دیا جائے، اور ہر ممکن طریقے سے اس میلان کو دبانے کی کوشش کی جائے، مگر صنفی میلان کا دبنا دراصل انسانیت کا دبنا ہے۔ وہ اکیلا نہیں دبے گا بلکہ اپنے ساتھ انسان کی ذہانت، اور قوتِ عمل، اور عقلی استعداد، اور حوصلہ و عزم، اور ہمت و شجاعت سب کو لے کر دب جائے گا، اس کے دبنے سے انسان کی ساری قوتیں ٹھٹھر کر رہ جائیں گی، اس کا خون سرد اور منجمد ہو کر رہ جائے گا۔ اس میں ابھرنے کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہے گی۔ کیوں کہ انسان کی سب سے بڑی محرک طاقت یہی صنفی طاقت ہے۔

پس صنفی میلان کو افراط و تفریط سے روک کر توسط و اعتدال کی حالت پر لانا اور اسے ایک مناسب ضابطے سے منضبط (Regulate) کرنا ایک صالح تمدّن کا اوّلین فریضہ ہے۔ اجتماعی زندگی کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ایک طرف غیر معتدل (Abnormal) ہیجان و تحریک کے ان تمام اسباب کو روک دے جن کو انسان خود اپنے ارادے اور اپنی لذّت پرستی سے پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف فطری (Normal) ہیجانات کی تسکین و تشفی کے لیے ایسا راستہ کھول دے جو خود منشائے فطرت کے مطابق ہو۔

## ۲- خاندان کی تاسیس

اب یہ سوال خود بخود ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کا منشاء کیا ہے؟ کیا اس معاملے میں ہم کو بالکل تاریکی میں چھوڑ دیا گیا ہے کہ آنکھیں بند کر کے ہم جس چیز پر چاہیں ہاتھ رکھ دیں

اور وہی فطرت کا منشا قرار پا جائے؟ یا نوامیسِ فطرت پر غور کرنے سے ہم منشاءِ فطرت تک پہنچ سکتے ہیں؟ شاید بہت سے لوگ صورتِ اول ہی کے قائل ہیں، اور اسی لیے وہ نوامیسِ فطرت پر نظر کیے بغیر ہی کیف ما اتفق جس چیز کو چاہتے ہیں، منشا فطرت کہہ دیتے ہیں۔ لیکن ایک محقق جب حقیقت کی جستجو کے لیے نکلتا ہے تو چند ہی قدم چل کر اُسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا فطرت آپ ہی اپنے منشا کی طرف صاف انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہی ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ تمام انواعِ حیوانی کی طرح انسان کی بھی زوجین یعنی دو صنفوں کی صورت میں پیدا کرنے اور اُن کے درمیان صنفی کشش کی تخلیق کرنے سے فطرت کا اوّلین مقصد بقائے نوع ہے، لیکن انسان سے فطرت کا مطالبہ صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ وہ اس سے بڑھ کر کچھ دوسرے مطالبات بھی اس سے کرتی ہے اور بادنیٰ تامل ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ مطالبات کیا ہیں اور کس نوعیت کے ہیں۔

سب سے پہلے جس چیز پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام حیوانات کے برعکس انسان کا بچہ نگہداشت اور پرورش کے لیے بہت زیادہ وقت، محنت اور توجہ مانگتا ہے۔ اگر اس کو مجرد ایک حیوانی وجود ہی کی حیثیت سے لے لیا جائے، تب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے، یعنی غذا حاصل کرنے اور اپنے نفس کی مدافعت کرنے کے قابل ہوتے ہوتے وہ کئی سال لے لیتا ہے، اور ابتدائی دو تین سال تک تو وہ اتنا بے بس ہوتا ہے کہ ماں کی پیہم توجہ کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ انسان خواہ وحشت کے کتنے ہی ابتدائی درجے میں ہو، بہر حال نرا حیوان نہیں ہے، کسی نہ کسی مرتبے کی مدنیّت بہر حال اس کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ اور اس مدنیّت کی وجہ سے پرورشِ اولاد کے فطری تقاضے پر لامحالہ دو اور تقاضوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ بچّے کی پرورش میں اُن تمام تمدنی وسائل سے کام لیا جائے جو اس کے پرورش کرنے والے کو بہم پہنچ سکیں۔ دوسرے یہ کہ بچّے کو ایسی تربیت دی جائے کہ جس تمدنی ماحول میں وہ پیدا ہوا ہے وہاں تمدن کے کارخانے کو چلانے اور سابق کارکنوں کی جگہ لینے کے لیے وہ تیار ہو سکے۔

پھر تمدن جتنا زیادہ ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجے کا ہوتا جاتا ہے یہ دونوں تقاضے بھی اتنے

ہی زیادہ بھاری اور بوجھل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک طرف پرورشِ اولاد کے ضروری وسائل و لوازم بڑھتے جاتے ہیں اور دوسری طرف تمدّن نہ صرف اپنے قیام و بقا کے لیے اپنے مرتبے کے مطابق اچھے تعلیم و تربیت یافتہ کارکن مانگتا ہے، بلکہ اپنے نشو و ارتقا کے لیے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ ہر نسل پہلی نسل سے بہتر اٹھے، یعنی دوسرے الفاظ میں ہر بچّے کا نگہبان اس کو خود اپنے آپ سے بہتر بنانے کی کوشش کرے ـــــ انتہا درجے کا ایثار جو انسان سے جذبۂ خود پسندی تک کی قربانی مانگتا ہے۔

یہ ہے فطرتِ انسانی کے مطالبات اور ان مطالبات کی اوّلین مخاطب عورت ہے۔ مرد ایک ساعت کے لیے عورت سے مل کر ہمیشہ کے لیے اُس سے اور اس ملاقات کی ذمے داری سے الگ ہوسکتا ہے۔ لیکن عورت کو تو اس ملاقات کا قدرتی نتیجہ برسوں کے لیے بلکہ عمر بھر کے لیے پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ حمل قرار پا جانے کے بعد سے کم از کم پانچ برس تک تو یہ نتیجہ اس کا پیچھا کسی طرح چھوڑتا ہی نہیں۔ اور اگر تمدن کے پورے مطالبات ادا کرنے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مزید پندرہ سال تک وہ عورت، جس نے ایک ساعت کے لیے مرد کی معیّت کا لطف اٹھایا تھا، اس کی ذمے داریوں کا بار سنبھالتی رہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مشترک فعل کی ذمے داری قبول کرنے کے لیے تنہا ایک فریق کس طرح آمادہ ہوسکتا ہے؟ جب تک عورت کو اپنے شریکِ کار کی بے وفائی کے خوف سے نجات نہ ملے، جب تک اسے اپنے بچّے کی پرورش کا پورا اطمینان نہ ہو جائے گا، جب تک اُسے خود اپنی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے کام سے بھی ایک بڑی حد تک سبکدوش نہ کر دیا جائے، وہ اتنے بھاری کام کا بوجھ اٹھانے پر کیسے آمادہ ہو جائے گی؟ جس عورت کا کوئی قوّام (Protector, Provider) نہ ہو اس کے لیے تو حمل یقیناً ایک حادثہ، ایک مصیبت، بلکہ ایک خطرناک بلا ہے، جس سے چھٹکارا پانے کی خواہش اُس میں طبعی طور پر پیدا ہونی ہی چاہیے۔ آخر وہ اسے خوش آمدید کس طرح کہہ سکتی ہے؟

لامحالہ یہ ضروری ہے ـــ اگر نوع کا بقا اور تمدّن کا قیام و ارتقا ضروری ہے ـــ کہ جو مرد جس عورت کو بار آور کرے وہی اس بار کو سنبھالنے میں اس کا شریک بھی ہو، مگر اس شرکت پر اسے راضی کیسے کیا جائے؟ وہ تو فطرتاً خود غرض واقع ہوا ہے، جہاں تک بقائے نوع کے طبعی فریضے

کا تعلق ہے، اس کے حصے کا کام تو اسی ساعت پورا ہو جاتا ہے جب کہ وہ عورت کو بار آور کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ بار تنہا عورت کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ اور مرد سے وہ کسی طرح بھی چسپاں نہیں ہوتا۔ جہاں تک صنفی کشش کا تعلق ہے وہ بھی اسے مجبور نہیں کرتی کہ اسی عورت کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ چاہے تو اسے چھوڑ کر دوسری اور دوسری کو چھوڑ کر تیسری سے تعلق پیدا کر سکتا ہے اور ہر زمین میں بیج پھینکتا پھر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ معاملہ محض اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بہ خوشی اس بار کو سنبھالنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ آخر کون سی چیز اُسے مجبور کرنے والی ہے کہ وہ اپنی محنتوں کا پھل اس عورت اور اُس بچے پر صرف کرے؟ کیوں وہ ایک دوسری حسین دوشیزہ کو چھوڑ کر اس پیٹ پھولی عورت سے اپنا دل لگائے رکھے؟ کیوں وہ گوشت پوست کے ایک بیکار لوتھڑے کو خواہ مخواہ اپنے خرچ پر پالے؟ کیوں اس کی چیخوں سے اپنی نیند حرام کرے؟ کیوں اس چھوٹے سے شیطان کے ہاتھوں اپنا نقصان کرائے جو ہر چیز کو توڑتا پھوڑتا اور گھر بھر میں گندگی پھیلاتا پھرتا ہے۔ اور کسی کی سن کر نہیں دیتا؟

فطرت نے کسی حد تک اس مسئلے کے حل کا خود بھی اہتمام کیا ہے، اُس نے عورت میں حُسن، شیرینی، دل لبھانے کی طاقت، اور محبت کے لیے ایثار و قربانی کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے تاکہ ان ہتھیاروں سے مرد کی خود غرضانہ انفرادیت پر فتح پائے اور اُسے اپنا اسیر بنا لے۔ اس نے بچّے کے اندر بھی ایک عجیب قوتِ تسخیر بھر دی ہے تاکہ وہ اپنی تکلیف دہ، برباد کن، پاجیانہ خصوصیت کے باوجود ماں باپ کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار رکھے۔ مگر صرف یہی چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ بجائے خود ان کا زور انسان کو اپنے اخلاقی، فطری، تمدّنی، فرائض ادا کرنے کے لیے برسوں نقصان، اذیّت اور قربانی برداشت کرنے پر مجبور کر سکے، آخر انسان کے ساتھ اس کا وہ ازلی دشمن شیطان بھی تو لگا ہوا ہے جو اسے فطرت کے راستے سے منحرف کرنے کی ہر وقت کوشش کرتا رہتا ہے۔ جس کی زنبیلِ عیاری میں ہر زمانے اور ہر نسل کے لوگوں کو بہکانے کے لیے طرح طرح کی دلیلوں اور ترغیبات کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ بھرا ہوا ہے۔

یہ مذہب کا معجزہ ہے کہ وہ انسان کو ــــ مرد اور عورت دونوں کو ــــ نوع اور تمدن کے لیے قربانی پر آمادہ کرتا ہے، اور اس خود غرض جانور کو آدمی بنا کر ایثار کے لیے تیار کر دیتا ہے۔ وہ خدا

کے بھیجے ہوئے انبیاء ہی تھے جنہوں نے فطرت کے منشا کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر عورت اور مرد کے درمیان تعلق اور تمدّنی تعاون کی صحیح صورت، نکاح تجویز کی۔ انہی کی تعلیم وہدایت سے دنیا کی ہر قوم اور روئے زمین کے ہر گوشے میں نکاح کا طریقہ جاری ہوا۔ انہی کے پھیلائے ہوئے اخلاقی اصولوں سے انسان کے اندر اتنی روحانی صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ اس خدمت کی تکلیفیں اور نقصانات برداشت کرے۔ ورنہ حق یہ ہے کہ ماں اور باپ سے زیادہ بچّے کا دشمن اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ انہی کے قائم کیے ہوئے ضوابطِ معاشرت سے خاندانی نظام کی بنا پڑی۔ جس کی مضبوط گرفت لڑکیوں اور لڑکوں کو اس ذمے دارانہ تعلق اور اس اشتراکِ عمل پر مجبور کرتی ہے۔ ورنہ شباب کے حیوانی تقاضوں کا زور اتنا سخت ہوتا ہے کہ محض اخلاقی ذمے داری کا احساس کسی خارجی ڈسپلن کے بغیر اُن کو آزاد شہوت رانی سے نہ روک سکتا تھا۔ شہوت کا جذبہ بجائے خود اجتماعیت کا دشمن (Anti-Social) ہے۔ یہ خود غرضی، انفرادیت اور انارکی کا میلان رکھنے والا جذبہ ہے۔ اس میں پائیداری نہیں، اس میں احساسِ ذمے داری نہیں، یہ محض وقتی لطف اندوزی کے لیے تحریک کرتا ہے۔ اس دیو کو مسخر کر کے اس سے اجتماعی زندگی کی ــــ اس زندگی کی جو صبر وثبات، محنت و قربانی، ذمے داری اور پیہم جفاکشی چاہتی ہے ــــ خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ نکاح کا قانون اور خاندان کا نظام ہی ہے جو اس دیو کو شیشے میں اتار کر اُس سے شرارت اور بدنظمی کی ایجنسی چھین لیتا ہے اور اسے مرد و عورت کے اس لگاتار تعاون واشتراکِ عمل کا ایجنٹ بنا دیتا ہے جو اجتماعی زندگی کی تعمیر کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کی تمدّنی زندگی ختم ہو جائے۔ انسان حیوان کی طرح رہنے لگیں، اور بالآخر نوعِ انسانی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے۔

پس صنفی میلان کو انارکی اور بے اعتدالی سے روک کر اس کے فطری مطالبات کی تشفی و تسکین کے لیے جو راستہ خود فطرت چاہتی ہے کہ کھولا جائے وہ صرف یہی ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کی صورت میں مستقل وابستگی ہو۔ اور اس وابستگی سے خاندانی نظام کی بنا پڑے۔ تمدّن کے وسیع کارخانے کو چلانے کے لیے جن پرزوں کی ضرورت ہے، وہ خاندان کی اسی چھوٹی کارگاہ میں تیار کیے جاتے ہیں۔ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے جوان ہوتے ہی کارگاہ کے منتظمین کو خود بخود یہ فکر لگ جاتی ہے کہ حتی الامکان اُن کے ایسے جوڑ لگائیں جو ایک دوسرے

کے لیے زیادہ مناسب ہوں تا کہ ان کے ملاپ سے زیادہ سے زیادہ بہتر نسل پیدا ہو سکے۔ پھر اُن سے جو نسل نکلتی ہے، اس کارگاہ کا ہر کارکن اپنے دل کے سچے جذبے سے کوشش کرتا ہے کہ اس کو جتنا بہتر بنا سکتا ہے بنائے۔ زمین پر اپنی زندگی کا پہلا لمحہ شروع کرتے ہی بچّے کو خاندان کے دائرے میں محبت، خبر گیری، حفاظت اور تربیت کا وہ ماحول ملتا ہے جو اس کے نشو و نما کے لیے آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے۔ درحقیقت خاندان ہی میں بچے کو وہ لوگ مل سکتے ہیں جو اس سے نہ صرف محبت کرنے والے ہوں، بلکہ جو اپنے دل کی امنگ سے یہ چاہتے ہوں کہ بچّہ جس مرتبے پر پیدا ہوا ہے اس سے اونچے مرتبے پر پہنچے۔

دنیا میں صرف ماں اور باپ ہی کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بچّے کو ہر لحاظ سے خود اپنے سے بہتر حالت میں اور اپنے سے بڑھا ہوا دیکھیں۔ اس طرح وہ بلا ارادہ غیر شعوری طور پر آیندہ نسل کو موجودہ نسل سے بہتر بنانے اور انسانی ترقی کا راستہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اس کوشش میں خود غرضی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ اپنے لیے کچھ نہیں چاہتے، وہ بس اپنے بچّے کی فلاح چاہتے ہیں۔ اور اس کے ایک کامیاب اور عمدہ انسان بن کر اٹھنے ہی کو اپنی محنت کا کافی صلہ سمجھتے ہیں۔ ایسے مخلص کارکن (Labourers) اور ایسے بے غرض خادم (Workers) تم کو خاندان کی اس کارگاہ کے باہر کہاں ملیں گے، جو نوعِ انسانی کی بہتری کے لیے نہ صرف بلا معاوضہ محنت کریں، بلکہ اپنا وقت، اپنی آسائش، اپنی قوت و قابلیت اور اپنی محنت کی کمائی، سب کچھ اس خدمت میں صرف کر دیں؟ جو اس چیز پر اپنی ہر قیمتی شے قربان کرنے کے لیے تیار ہوں؟ جس کا پھل دوسرے کھانے والے ہیں؟ جو اپنی محنتوں کا صلہ بس اس کو سمجھیں کہ دوسروں کے لیے انہوں نے بہتر کارکن اور خادم فراہم کر دیے؟ کیا اس سے زیادہ پاکیزہ اور بلند ترین ادارہ انسانیت میں کوئی دوسرا بھی ہے؟

ہر سال نسلِ انسانی کو اپنے بقا کے لیے اور تمدّنِ انسانی کو اپنے تسلسل و ارتقا کے لیے ایسے لاکھوں اور کروڑوں جوڑوں کی ضرورت ہے جو بخوشی و رضا اپنے آپ کو اس خدمت اور اس کی ذمے داریوں کے لیے پیش کریں اور نکاح کر کے اس نوعیت کی مزید کارگاہوں کی بنا ڈالیں۔ یہ عظیم الشان کارخانہ جو دنیا میں چل رہا ہے، یہ اسی طرح چل اور بڑھ سکتا ہے کہ اس قسم کے

رضا کار پیہم خدمت کے لیے اٹھتے رہیں۔ اور اس کارخانہ کے لیے کام کے آدمی فراہم کرتے رہیں۔ اگر نئی بھرتی نہ ہو، اور قدرتی اسباب سے پُرانے کارکن بیکار ہو کر ہٹتے جائیں تو کام کے آدمی کم اور کم تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اور ایک دن یہ سازِ ہستی بالکل بے نوا ہو کر رہ جائے گا۔ ہر آدمی جو اس تمدّن کی مشین کو چلا رہا ہے اس کا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے جیتے جی اس کو چلائے جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ اپنی جگہ لینے کے لیے اپنی ہی جیسے اشخاص مہیا کرنے کی کوشش کرے۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نکاح کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ صنفی جذبات کی تسکین و تشفی کے لیے ایک ہی جائز صورت ہے، بلکہ دراصل یہ ایک اجتماعی فریضہ ہے، یہ فرد پر جماعت کا فطری حق ہے اور فرد کو اس بات کا اختیار ہرگز نہیں دیا جا سکتا کہ وہ نکاح کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ خود اپنے لیے محفوظ رکھے۔ جو لوگ بغیر کسی معقول وجہ کے نکاح سے انکار کرتے ہیں وہ جماعت کے نکھٹو افراد (Parasites) بلکہ غدّار اور لٹیرے ہیں۔ ہر فرد جو زمین پر پیدا ہوا ہے، اس نے زندگی کا پہلا سانس لینے کے بعد سے جوانی کی عمر کو پہنچنے تک اس بے حد وحساب سرمایے سے استفادہ کیا ہے جو پچھلی نسلوں نے فراہم کیا تھا، اُن کے قائم کیے ہوئے ادارات ہی کی بدولت اس کو زندہ رہنے، بڑھنے، پھلنے پھولنے اور آدمیت میں نشو ونما پانے کا موقع ملا۔ اس دوران میں وہ لیتا ہی رہا، اس نے دیا کچھ نہیں۔ جماعت نے اس امید پر اس کی ناقص قوتوں کو تکمیل کی طرف لے جانے میں اپنا سرمایہ اور اپنی قوت صرف کی کہ جب وہ خود کچھ دینے کے قابل ہوگا، تو دے گا۔ اب اگر وہ بڑا ہو کر اپنے لیے شخصی آزادی اور خود مختاری کا مطالبہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں صرف اپنی خواہشات پوری کروں گا، مگر ان ذمے داریوں اور اُن فرائض کا بوجھ نہ اٹھاؤں گا، جو اُن خواہشات کے ساتھ وابستہ ہیں تو دراصل وہ جماعت کے ساتھ غداری اور دھوکے بازی کرتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ ایک ظلم اور بے انصافی ہے۔ جماعت میں اگر شعور موجود ہو تو وہ اس مجرم کو جنٹلمین، یا معزز لیڈی یا مقدس بزرگ سمجھنے کے بجائے اس نظر سے دیکھے جس سے وہ چوروں، ڈاکوؤں اور جعل سازوں کو دیکھتی ہے۔ ہم نے خواہ چاہا ہو یا نہ چاہا ہو، بہر طور ہم اس تمام سرمایہ اور ذخیرے کے وارث ہوئے ہیں، جو ہم سے پہلے کی نسلوں نے چھوڑا ہے۔ اب ہم اس فیصلے میں آزاد کیسے ہو سکتے ہیں کہ جس فطری قانون کے مطابق یہ ورثہ ہم تک پہنچا ہے اس کے منشا کو پورا کریں یا نہ کریں؟ ایسی نسل تیار

کریں یا نہ کریں جو نوعِ انسانی کے اس سرمایے اور ذخیرے کی وارث ہو؟ اس کو سنبھالنے کے لیے دوسرے آدمی اسی طرح تیار کریں یا نہ کریں جس طرح ہم خود تیار کیے گئے ہیں؟

## ۴- صنفی آوارگی کا سدّ باب

نکاح اور تاسیسِ خاندان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حصنِ نکاح سے باہر خواہشاتِ صنفی کی تسکین کا دروازہ سختی کے ساتھ بند کیا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر فطرت کا وہ منشا پورا نہیں ہوسکتا، جس کے لیے وہ نکاح اور تاسیسِ خاندان کا تقاضا کرتی ہے۔

پرانی جاہلیت کی طرح اس نئی جاہلیت کے دور میں بھی اکثر لوگ زنا کو ایک فطری فعل سمجھتے ہیں اور نکاح ان کے نزدیک محض تمدّن کی ایجاد کردہ مصنوعات یا زوائد میں سے ایک چیز ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ فطرت نے جس طرح ہر بکری کو ہر بکرے کے لیے، اور ہر کتیا کو ہر کتے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح ہر عورت کو بھی ہر مرد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور فطری طریقہ یہی ہے کہ جب خواہش ہو، جب موقع بہم پہنچ جائے، اور جب دونوں صنفوں کے کوئی سے دو فرد باہم راضی ہوں، تو ان کے درمیان اُسی طرح صنفی عمل واقع ہو جائے، جس طرح جانوروں میں ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فطرت انسانی کی بالکل غلط تعبیر ہے۔ ان لوگوں نے انسان کو محض ایک حیوان سمجھ لیا ہے، لہٰذا جب کبھی یہ فطرت کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ان کی مراد حیوانی فطرت ہوتی ہے نہ کہ انسانی فطرت۔ جس منتشر صنفی تعلّق کو یہ فطری کہتے ہیں، وہ حیوانات کے لیے تو ضرور فطری ہے، مگر انسان کے لیے ہرگز فطری نہیں۔ وہ نہ صرف انسانی فطرت کے خلاف ہے، بلکہ اپنے آخری نتائج کے اعتبار سے اس حیوانی فطرت کے بھی خلاف ہو جاتا ہے جو انسان کے اندر موجود ہے۔ اس لیے کہ انسان کے اندر انسانیت اور حیوانیت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ دراصل ایک وجود کے اندر دونوں مل کر ایک ہی شخصیت بناتی ہیں۔ اور دونوں کے مقتضیات باہم ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جاتے ہیں کہ جہاں ایک کے منشا سے منہ موڑا گیا، دوسری کا منشا بھی خود بخود فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

زنا میں بظاہر آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کم از کم فطرتِ حیوانی کے اقتضا کو پورا

کر دیتی ہے، کیونکہ تناسل اور بقائے نوع کا مقصد مجرد صنفی عمل سے پورا ہو جاتا ہے، عام اس سے کہ وہ نکاح کے اندر ہو یا باہر۔ لیکن اس سے پہلے جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اس پر پھر ایک نگاہ ڈال کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ فعل جس طرح فطرتِ انسانی کے مقصد کو نقصان پہنچاتا ہے اسی طرح فطرتِ حیوانی کے مقصد کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ فطرتِ انسانی چاہتی ہے کہ صنفی تعلق میں استحکام اور استقلال ہو، تاکہ بچے کو ماں اور باپ مل کر پرورش کریں اور ایک کافی مدّت تک مرد نہ صرف بچے کا بلکہ بچے کی ماں کا بھی کفیل رہے۔ اگر مرد کو یقین نہ ہو کہ بچہ اسی کا ہے تو وہ اس کی پرورش کے لیے قربانی اور تکلیفیں برداشت ہی نہ کرے گا اور نہ یہی گوارا کرے گا کہ وہ اس کے بعد اس کے ترکے کا وارث ہو۔ اسی طرح اگر عورت کو یقین نہ ہو کہ جو مرد اسے بار آور کر رہا ہے وہ اس کی اور اس کے بچے کی کفالت کے لیے تیار ہے تو وہ حمل کی مصیبت اٹھانے کے لیے تیار ہی نہ ہوگی۔ اگر بچے کی پرورش میں ماں اور باپ تعاون نہ کریں تو اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی اخلاقی، ذہنی اور معاشی حیثیت کبھی اس معیار پر نہ پہنچ سکے گی، جس سے وہ انسانی تمدّن کے لیے کوئی مفید کارکن بن سکے۔ یہ سب فطرتِ انسانی کے مقتضیات ہیں، اور جب ان مقتضیات سے منہ موڑ کر محض حیوانوں کی طرح مرد اور عورت عارضی تعلق قائم کرتے ہیں۔ تو وہ خود فطرتِ حیوانی کے اقتضا (یعنی توالد و تناسل) سے بھی منہ موڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت توالد و تناسل ان کے پیش نظر نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا۔ اس وقت اُن کے درمیان صنفی تعلق صرف خواہشاتِ نفس کی تسکین اور صرف لذت طلبی و لطف اندوزی کے لیے ہوتا ہے جو سرے سے منشاءِ فطرت کے خلاف ہے۔

جاہلیتِ جدیدہ کے علم بردار اس پہلو کو خود بھی کمزور پاتے ہیں۔ اس لیے وہ اس پر ایک اور استدلال کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر جماعت کے دو فرد آپس میں مل کر چند ساعتیں لطف اور تفریح میں گذار دیں تو اس میں آخر سوسائٹی کا کیا بگڑتا ہے کہ وہ اس میں مداخلت کرے؟ سوسائٹی اس صورت میں تو ضرور مداخلت کا حق رکھتی ہے جب کہ ایک فریق دوسرے پر جبر کرے یا دھوکے اور فریب سے کام لے۔ یا کسی جماعتی قضیہ کا سبب بنے۔ لیکن جہاں ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہو، اور صرف دو اشخاص کے درمیان لذت اندوزی ہی کا معاملہ ہو تو سوسائٹی کو

اُن کے بیچ میں حائل ہونے کا کیا حق ہے؟ لوگوں کے ایسے پرائیوٹ معاملات میں بھی اگر دخل دیا جائے تو شخصی آزادی محض ایک لفظِ بے معنٰی ہو کر رہ جائے گی۔

شخصی آزادی کا یہ تصوّر اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ان جہالتوں میں سے ایک ہے جن کی تاریکی، علم اور تحقیق کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی کافور ہو جاتی ہے۔ تھوڑے سے غور و خوض کے بعد ہی آدمی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ جس آزادی کا مطالبہ افراد کے لیے کیا جا رہا ہے اس کے لیے کوئی گنجائش جماعتی زندگی میں نہیں ہے۔ جس کو ایسی آزادی مطلوب ہو اُسے جنگل میں جا کر حیوانوں کی طرح رہنا چاہیے۔ انسانی اجتماع تو دراصل علائق و روابط کے ایسے جال کا نام ہے، جس میں ہر فرد کی زندگی دوسرے بے شمار افراد کے ساتھ وابستہ ہے، اُن پر اثر ڈالتی ہے اور اُن سے اثر قبول کرتی ہے۔ اس تعلقِ باہمی میں انسان کے کسی فعل کو بھی خالص شخصی اور بالکل انفرادی نہیں کہا جا سکتا۔ کسی ایسے شخصی فعل کا تصور بھی نہیں جا سکتا، جس کا اثر بحیثیتِ مجموعی پوری جماعت پر نہ پڑتا ہو۔ افعالِ جوارح تو درکنار، دل میں چھپا ہوا کوئی خیال بھی ایسا نہیں جو ہمارے وجود پر اور اس سے منعکس ہو کر دوسروں پر اثر انداز نہ ہوتا ہو۔ ہمارے قلب و جسم کی ایک ایک حرکت کے نتائج ہم سے منتقل ہو کر اتنی دور تک پہنچتے ہیں کہ ہمارا علم کسی طرح ان کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کا اپنی کسی قوت کو استعمال کرنا اُس کی اپنی ذات کے سوا کسی پر اثر نہیں ڈالتا۔ لہٰذا کسی کو اس سے کوئی سروکار نہیں، اور اُسے اپنے معاملے میں پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے؟ اگر مجھے یہ آزادی نہیں دی جا سکتی کہ ہاتھ میں لکڑی لے کر جہاں چاہوں گھماؤں، اپنے پاؤں کو حرکت دے کر جہاں چاہوں گھس جاؤں، اپنی گاڑی کو جس طرح چاہوں چلاؤں، اپنے گھر میں جتنی غلاظت چاہوں جمع کر لوں، اگر یہ اور ایسے ہی بے شمار شخصی معاملات اجتماعی ضوابط کے پابند ہونے ضروری ہیں تو آخر میری قوتِ شہوانی ہی تنہا اس شرف کی حق دار کیوں ہو کہ اُسے کسی اجتماعی ضابطے کا پابند نہ بنایا جائے اور مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اسے جس طرح چاہوں صَرف کروں؟

یہ کہنا کہ ایک مرد اور ایک عورت باہم مل کر ایک پوشیدہ مقام پر سب سے الگ جو لطف اٹھاتے ہیں اس کا کوئی اثر اجتماعی زندگی پر نہیں پڑتا، محض بچوں کی سی بات ہے۔ دراصل اس کا اثر

صرف اس سوسائٹی پر ہی نہیں پڑتا جس سے وہ براہ راست متعلق ہیں، بلکہ پوری انسانیت پر پڑتا ہے، اور اس کے اثرات صرف حال کے لوگوں ہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتے ہیں۔ جس اجتماعی وعمرانی رابطے میں پوری انسانیت بندھی ہوئی ہے، اس سے کوئی فرد کسی حال میں کسی محفوظ مقام پر بھی الگ نہیں ہے۔ بند کمروں میں، دیواروں کی حفاظت میں بھی وہ اسی طرح جماعت کی زندگی سے مربوط ہے، جس طرح بازار یا محفل میں ہے۔ جس وقت وہ خلوت میں اپنی تولیدی طاقت کو ایک عارضی اور غیر نتیجہ لطف اندوزی پر ضائع کر رہا ہوتا ہے اس وقت دراصل وہ اجتماعی زندگی میں بدنظمی پھیلانے اور نوع کی حق تلفی کرنے اور جماعت کو بے شمار اخلاقی، مادّی، تمدنی نقصانات پہنچانے میں مشغول ہوتا ہے۔ وہ اپنی خودغرضی سے ان تمام اجتماعی ادارات پر ضرب لگاتا ہے، جن سے اس نے جماعت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے فائدہ تو اٹھایا مگر ان کے قیام وبقا میں اپنا حصّہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ جماعت نے میونسپلٹی سے لے کر اسٹیٹ تک، مدرسے سے لے کر فوج تک، کارخانوں سے لے کر علمی تحقیقات کی مجلسوں تک، جتنے بھی ادارے قائم کر رکھے ہیں، سب اسی اعتماد پر قائم کیے ہیں کہ ہر فرد جو اُن سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اُن کے قیام اور اُن کی ترقی میں اپنا واجبی حصّہ ادا کرے گا۔ لیکن جب اس بے ایمان نے اپنی قوتِ شہوانی کو اس طرح استعمال کیا کہ اس میں توالد وتناسُل اور تربیتِ اطفال کے فرائض انجام دینے کی سرے سے نیت ہی نہ تھی تو اس نے ایک ہی ضرب میں اپنی حد تک اس پورے نظام کی جڑ کاٹ دی۔ اس نے اُس اجتماعی معاہدہ کو توڑ ڈالا، جس میں وہ عین اپنے انسان ہونے کی حیثیت ہی سے شریک تھا۔ اس نے اپنے ذمے کا بار خود اٹھانے کے بجائے دوسروں پر سارا بار ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے، بلکہ ایک چور، خائن اور لٹیرا ہے۔ اس کے ساتھ رعایت کرنا پوری انسانیت پر ظلم کرنا ہے۔

اجتماعی زندگی میں فرد کا مقام کیا ہے، اس چیز کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہ سکتا کہ ایک ایک قوت جو ہمارے نفس اور جسم میں ودیعت کی گئی ہے، محض ہماری ذات کے لیے نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہمارے پاس امانت ہے، اور ہم ان میں سے ہر ایک کے لیے پوری انسانیت کے حق میں جواب دِہ ہیں۔ اگر ہم خود اپنی جان کو یا اپنی

قوتوں میں سے کسی کو ضائع کرتے ہیں یا اپنی غلط کاری سے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتے ہیں، تو ہمارے اس فعل کی اصل حیثیت یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہمارا تھا اس کو ہم نے ضائع کیا یا نقصان پہنچادیا، بلکہ دراصل اس کی حیثیت یہ ہے کہ تمام عالمِ انسانی کے لیے جو امانت ہمارے پاس تھی، اس میں ہم نے خیانت کی اور اپنی اس حرکت سے پوری نوع کو نقصان پہنچایا۔ ہمارا دنیا میں موجود ہونا خود اس بات پر شاہد ہے کہ دوسروں نے ذمے داریوں اور تکلیفوں کا بوجھ اٹھا کر زندگی کا نور ہماری طرف منتقل کیا تب ہی ہم اس عالم میں آئے۔ پھر اسٹیٹ کی تنظیم نے ہماری جان کی حفاظت کی۔ حفظانِ صحت کے محکمے ہماری زندگی کے تحفظ میں لگے رہے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں نے مل کر ہماری ضروریات فراہم کیں۔ تمام اجتماعی اداروں نے مل کر ہماری قوتوں کو سنوارنے اور تربیت دینے کی کوشش کی اور ہمیں وہ کچھ بنایا جو ہم ہیں۔ کیا ان سب کا یہ جائز بدلہ ہوگا، کیا یہ انصاف ہوگا کہ جس جان اور جن قوتوں کے وجود، بقا، نشوونما میں دوسروں کا اتنا حصہ ہے اس کو ہم ضائع کردیں یا مفید بنانے کے بجائے مضر بنائیں؟ خودکشی اسی بنا پر حرام ہے۔ ہاتھ سے شہوت رانی کرنے والے کو اسی وجہ سے دنیا کے سب سے بڑے حکیم نے ملعون کہا ہے (نَاکِحُ الْیَدِ مَلْعُوْنٌ) عملِ قومِ لوط کو اسی بنیاد پر بدترین جرم قرار دیا گیا ہے، اور زنا بھی اسی وجہ سے انفرادی تفریح اور خوش وقتی نہیں ہے بلکہ پوری انسانی جماعت پر ظلم ہے۔

غور کیجیے، فعلِ زنا کے ساتھ کتنے اجتماعی مظالم کا قریبی اور گہرا رشتہ ہے:

(۱) سب سے پہلے ایک زانی اپنے آپ کو امراضِ خبیثہ کے خطرے میں ڈالتا ہے، اور اس طرح نہ صرف اپنی جسمانی قوتوں کی اجتماعی افادیت میں نقص پیدا کرتا ہے، بلکہ جماعت اور نسل کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ سوزاک کے متعلق ہر طبیب آپ کو بتادے گا کہ مجرائے بول کا یہ قرحہ شاذ ونادر ہی کامل طور پر مندمل ہوتا ہے۔ ایک بڑے ڈاکٹر کا قول ہے کہ: ایک دفعہ سوزاک ہمیشہ کے لیے سوزاک۔'' اس سے جگر، مثانہ، انثیین وغیرہ اعضا بھی بسا اوقات آفت رسیدہ ہوجاتے ہیں۔ گٹھیا اور بعض دوسرے امراض کا بھی یہ سبب بن جاتا ہے۔ اس سے مستقل بانجھ پن پیدا ہوجانے کا بھی امکان ہے۔ اور یہ دوسروں کی طرف متعدّی بھی ہوتا ہے۔ رہا آتشک تو کس کو معلوم نہیں کہ

اس سے پورا نظامِ جسمانی مسموم ہو جاتا ہے۔ سر سے پاؤں تک کوئی عضو بلکہ جسم کا کوئی جز ایسا نہیں جس میں اس کا زہر نفوذ نہ کر جاتا ہو۔ یہ نہ خود مریض کی جسمانی قوتوں کو ضائع کرتا ہے بلکہ ایک شخص سے نہ معلوم کتنے اشخاص تک مختلف ذرائع سے پہنچ جاتا ہے۔ پھر اس کی بدولت مریض کی اولاد اور اولاد کی اولاد تک بے قصور سزا بھگتتی ہے۔ بچوں کا اندھا، گونگا، بہرہ، فاترالعقل پیدا ہونا، لطف کی اُن چند گھڑیوں کا ایک معمولی ثمرہ ہے، جنہیں ظالم باپ نے اپنی زندگی کی متاعِ عزیز سمجھا تھا۔

(۲) امراضِ خبیثہ میں تو ہر زانی کا مبتلا ہو جانا یقینی نہیں ہے، مگر اُن اخلاقی کمزوریوں سے کسی کا بچنا ممکن نہیں جو اس فعل سے لازماً تعلق رکھتی ہیں۔ بے حیائی، فریب کاری، جھوٹ، بدنیتی، خودغرضی، خواہشات کی غلامی، ضبطِ نفس کی کمی، خیالات کی آوارگی، طبیعت میں ذوّاقی اور ہرجائی پن، اور ناوفاداری، یہ سب زنا کے وہ اخلاقی اثرات ہیں جو خود زانی کے نفس پر مترتّب ہوتے ہیں۔ جو شخص یہ خصوصیات اپنے اندر پرورش کرتا ہے اس کی کمزوریوں کا اثر محض صنفی معاملات ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کی طرف سے یہی ہدیہ جماعت کو پہنچتا ہے۔ اگر جماعت میں کثرت سے لوگوں کے اندر یہ اوصاف نشو ونما پا گئے ہوں تو ان کی بدولت آرٹ اور ادب، تفریحات اور کھیل، علوم اور فنون، صنعت اور حرفت، معاشرت اور معیشت، سیاست اور عدالت، فوجی خدمات، اور انتظامِ ملکی، غرض ہر چیز کم وبیش ماؤف ہو کر رہے گی۔ خصوصاً جمہوری نظام میں تو افراد کی ایک ایک اخلاقی خصوصیت کا پوری قوم کی زندگی پر منعکس ہونا یقینی ہے۔ جس قوم کے بیشتر افراد کے مزاج میں کوئی قرار وثبات نہ ہو، اور جس قوم کے اجزائے ترکیبی وفا سے، ایثار سے اور خواہشات پر قابو رکھنے کی صفات سے عاری ہوں اس کی سیاست میں استحکام آخر آئے گا کہاں سے؟

(۳) زنا کو جائز رکھنے کے ساتھ یہ بھی لازم ہو جاتا ہے کہ سوسائٹی میں فاحشہ گری کا کاروبار جاری رہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ایک جوان مرد کو ''تفریح'' کا حق حاصل

ہے، وہ گویا ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ایک معتد بہ طبقہ ایسی عورتوں کا موجود رہنا چاہیے جو ہر حیثیت سے انتہائی پستی و ذلت کی حالت میں ہوں، آخر یہ عورتیں آئیں گی کہاں سے؟ اسی سوسائٹی ہی میں سے تو پیدا ہوں گی۔ بہر حال کسی کی بیٹی اور بہن ہی تو ہوں گی، وہ لاکھوں عورتیں جو ایک ایک گھر کی ملکہ، ایک ایک خاندان کی بانی، کئی کئی بچوں کی مربی بن سکتی تھیں، انہیں کو لا کر تو بازار میں بٹھانا پڑے گا، تاکہ میونسپلٹی کے پیشاب خانوں کی طرح وہ آوارہ مزاج مردوں کے لیے رفعِ حاجت کا محل بنیں۔ ان سے عورت کی تمام شریفانہ خصوصیات چھینی جائیں، انہیں ناز فروشی کی تربیت دی جائے، انہیں اس غرض کے لیے تیار کیا جائے کہ اپنی محبت، اپنے دل، اپنے جسم، اپنے حسن اور اپنی اداؤں کو ہر ساعت ایک نئے خریدار کے ہاتھ بیچیں، اور کوئی نتیجہ خیز و بارآور خدمت کرنے کے بجائے تمام عمر دوسروں کی نفس پرستی کے لیے کھلونا بنی رہیں۔

(۴) زنا کے جواز سے نکاح کے تمدنی ضابطے کو لامحالہ نقصان پہنچتا ہے، بلکہ انجامِ کار نکاح ختم ہو کر صرف زنا ہی زنا رہ جاتی ہے۔ اوّل تو زنا کا میلان رکھنے والے مردوں اور عورتوں میں یہ صلاحیت ہی بہت کم باقی رہ جاتی ہے کہ صحیح ازدواجی زندگی بسر کرسکیں۔ کیونکہ جو بدنیتی، بدنظری ذوّاقی اور آوارہ مزاجی اس طریق کار سے پیدا ہوتی ہے، اور ایسے لوگوں میں جذبات کی جو بے ثباتی اور خواہشاتِ نفس پر قابو نہ رکھنے کی جو کمزوری پرورش پاتی ہے، وہ ان صفات کے لیے سمِّ قاتل ہے جو ایک کامیاب ازدواجی تعلق کے لیے ضروری ہیں۔ وہ اگر ازدواج کے رشتے میں بندھیں گے بھی تو اُن کے درمیان وہ حسنِ سلوک، وہ سہوگ، وہ باہمی اعتماد اور وہ مہر و وفا کا رابطہ کبھی استوار نہ ہوگا، جس سے اچھی نسل پیدا ہوتی ہے اور ایک مسرت بھرا گھر وجود میں آتا ہے۔ پھر جہاں زنا کی آسانیاں ہوں وہاں عملاً یہ ناممکن ہے کہ نکاح کا تمدن پرور طریقہ قائم رہ سکے۔ کیونکہ جن لوگوں کو ذمے داریاں قبول کیے بغیر خواہشاتِ نفس کی تسکین کے مواقع حاصل ہوں انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ نکاح کر کے اپنے سر پر بھاری ذمے داریوں کا بوجھ لادلیں؟

(۵) زنا کے جواز اور رواج سے نہ صرف تمدّن کی جڑ کٹتی ہے، بلکہ خود نسلِ انسانی کی جڑ بھی کٹتی ہے، جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے، آزادانہ صنفی تعلق میں مرد اور عورت دونوں میں سے کسی کی بھی یہ خواہش نہیں ہوتی اور نہیں ہو سکتی کہ بقائے نوع کی خدمت انجام دیں۔

(۶) زنا سے نوع اور سوسائٹی کو اگر بچّے ملتے بھی ہیں تو حرامی بچّے ہوتے ہیں۔ نسب میں حلال اور حرام کی تمیز محض ایک جذباتی چیز نہیں ہے جیسا کہ بعض نادان لوگ گمان کرتے ہیں۔ دراصل متعدد حیثیات سے حرام کا بچّہ پیدا کرنا خود بچّے پر اور پورے انسانی تمدّن پر ایک ظلمِ عظیم ہے۔ اوّل تو ایسے بچّے کا نطفہ ہی اُس حالت میں قرار پاتا ہے جب کہ ماں اور باپ دونوں پر خالص حیوانی جذبات کا تسلّط ہوتا ہے، ایک شادی شدہ جوڑے میں صنفی عمل کے وقت جو پاک انسانی جذبات ہوتے ہیں وہ ناجائز تعلق رکھنے والے جوڑے کو کبھی میسّر ہی نہیں آسکتے، ان کو تو مجرد بہیمیت کا جوش ایک دوسرے سے ملاتا ہے، اور اُس وقت تمام انسانی خصوصیات برطرف ہوتی ہیں، لہٰذا ایک حرامی بچّہ طبعاً اپنے والدین کی حیوانیت ہی کا وارث ہوتا ہے۔ پھر وہ بچہ جس کا خیر مقدم کرنے کے لیے نہ ماں تیار ہو نہ باپ، جو ایک مطلوب چیز کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ناگہانی مصیبت کی حیثیت سے والدین کے درمیان آیا ہو، جس کو باپ کی محبت اور اس کے وسائل بالعموم میسّر نہ آئیں، جو صرف ماں کی یک طرفہ تربیت پائے اور وہ بھی ایسی جس میں بے دلی اور بیزاری شامل ہو، جس کو دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، ماموں اور دوسرے اہلِ خاندان کی سرپرستی حاصل نہ ہو، وہ بہر حال ایک ناقص و نامکمل انسان ہی بن کر اٹھے گا۔ نہ اس کا صحیح کیرکٹر بن سکے گا نہ اس کی صلاحیتیں چمک سکیں گی، نہ اس کی ترقی اور کارپردازی کے پورے وسائل بہم پہنچ سکیں گے۔ وہ خود بھی ناقص، بے وسیلہ، بے یار و مددگار اور مظلوم ہوگا اور تمدّن کے لیے بھی کسی طرح اتنا مفید نہ بن سکے گا جتنا وہ حلالی ہونے کی صورت میں ہو سکتا تھا۔

آزاد شہوت رانی کے حامی کہتے ہیں کہ بچّوں کی پرورش اور تعلیم کے لیے ایک قومی نظام

ہونا چاہیے تا کہ بچّوں کو ان کے والدین اپنے آزادانہ تعلق سے جنم دیں اور قوم اُن کو پال پوس کر تمدّن کی خدمت کے لیے تیار کرے۔اس تجویز سے ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی آزادی اور اُن کی انفرادیت محفوظ رہے اور اُن کی نفسانی خواہشات کو نکاح کی پابندیوں میں جکڑے بغیر تولیدِ نسل و تربیتِ اطفال کا مدعا حاصل ہو جائے۔لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کو موجودہ نسل کی انفرادیت اتنی عزیز ہے وہ آئندہ نسل کے لیے قومی تعلیم یا سرکاری تربیت کا ایسا سسٹم تجویز کرتے ہیں، جس میں انفرادیت کے نشو و نما اور شخصیت کے ارتقا کی کوئی صورت نہیں ہے۔اس قسم کے ایک سسٹم میں جہاں ہزاروں لاکھوں بچّے بیک وقت ایک نقشے ایک ضابطے اور ایک ہی ڈھنگ پر تیار کیے جائیں، بچّوں کا انفرادی تشخص کبھی ابھر اور نکھر ہی نہیں سکتا۔ وہاں تو ان میں زیادہ سے زیادہ یکسانی اور مصنوعی ہمواری پیدا ہوگی۔اس کارخانے سے بچّے اسی طرح ایک سی شخصیت لے کر نکلیں گے جس طرح کسی بڑی فیکٹری سے لوہے کے پرزے یکساں ڈھلے ہوئے نکلتے ہیں۔غور تو کرو انسان کے متعلق ان کم عقل لوگوں کا تصور کتنا پست اور کتنا گھٹیا ہے۔یہ باٹا کے جوتوں کی طرح انسانوں کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔ان کو معلوم نہیں کہ بچے کی شخصیت کو تیار کرنا ایک لطیف ترین آرٹ ہے۔ یہ آرٹ ایک چھوٹے نگار خانے ہی میں انجام پا سکتا ہے۔ جہاں ہر مصوّر کی توجہ ایک ایک تصویر پر مرکوز ہو۔ایک بڑی فیکٹری میں جہاں کرایے کے مزدور ایک ہی طرز کی تصویر لاکھوں کی تعداد میں تیار کرتے ہوں، یہ آرٹ غارت ہوگا، نہ کہ ترقی کرے گا۔

پھر قومی تعلیم و تربیت کے اس سسٹم میں آپ کو بہر حال ایسے کارکنوں کی ضرورت ہوگی جو سوسائٹی کی طرف سے بچّوں کی پرورش کا کام سنبھالیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس خدمت کو انجام دینے کے لیے ایسے ہی کارکن موزوں ہو سکتے ہیں جو اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھتے ہوں اور جن میں خود اخلاقی انضباط پایا جاتا ہو ورنہ وہ بچّوں میں اخلاقی انضباط کیسے پیدا کر سکیں گے۔اب سوال یہ ہے کہ ایسے آدمی آپ

لائیں گے کہاں سے؟ آپ تو قومی تعلیم وتربیت کا سسٹم قائم ہی اس لیے کر رہے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح جب آپ نے سوسائٹی میں سے اخلاقی انضباط اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت کا بیج ہی مار دیا تو اندھوں کی بستی میں آنکھوں والے دستیاب کہاں ہوں گے کہ وہ نئی نسلوں کو دیکھ کر چلنا سکھائیں؟

(۷) زنا کے ذریعے سے ایک خودغرض انسان جس عورت کو بچے کی ماں بنا دیتا ہے اُس کی زندگی ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاتی ہے، اور اس پر ذلت اور نفرتِ عامہ اور مصائب کا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے کہ جیتے جی وہ اس کے بوجھ تلے سے نہیں نکل سکتی۔ نئے اخلاقی اصولوں میں اس مشکل کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ ہر قسم کی مادری کو مساوی حیثیت دے دی جائے، خواہ وہ قیدِ نکاح کے اندر ہو یا باہر۔

کہا جاتا ہے کہ مادریت بہر حال قابلِ احترام ہے اور یہ کہ جس لڑکی نے اپنی سادگی سے یا بے احتیاطی سے ماں بننے کی ذمے داری قبول کر لی ہے، اس پر یہ ظلم ہے کہ سوسائٹی میں اسے مطعون کیا جائے۔

لیکن اول تو یہ حل ایسا ہے کہ اس میں فاحشہ عورتوں کے لیے چاہے کتنی ہی سہولت ہو، سوسائٹی کے لیے بحیثیت مجموعی سراسر مصیبت ہی مصیبت ہے۔ سوسائٹی فطرتاً حرامی بچے کی ماں کو جس نفرت اور ذلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے وہ ایک طرف افراد کو گناہ اور بدکاری سے روکنے کے لیے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اور دوسری طرف وہ خود سوسائٹی میں بھی اخلاقی حِس کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ اگر حرامی بچے کی ماں اور حلالی بچے کی ماں کو مساوی سمجھا جانے لگا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جماعت سے خیر اور شر، بھلائی اور برائی، گناہ اور صواب کی تمیز ہی رخصت ہو گئی۔ پھر اگر بالفرض یہ ہو بھی جائے تو کیا اس سے فی الواقع وہ مشکلات حل ہو جائیں گی۔ جو حرامی بچے کی ماں کو پیش آتی ہیں۔ تم اپنے نظریے میں حرام اور حلال دونوں قسم کی مادری کو مساوی قرار

دے سکتے ہو، مگر فطرت ان دونوں کو مساوی نہیں کرتی اور حقیقت میں وہ کبھی مساوی ہو ہی نہیں سکتیں۔ ان کی مساوات عقل، منطق، انصاف، حقیقت ہر چیز کے خلاف ہے۔ آخر وہ بے وقوف عورت جس نے شہوانی جذبات کے وقتی ہیجان سے مغلوب ہو کر اپنے آپ کو ایک ایسے خودغرض آدمی کے حوالے کر دیا جو اس کی اور اس کے بچے کی کفالت کا ذمہ لینے کے لیے تیار نہ تھا، اُس عقل مند عورت کے برابر کس طرح ہو سکتی ہے، جس نے اپنے جذبات کو اس وقت تک اپنے قابو میں رکھا جب تک اسے ایک شریف ذمے دار آدمی نہ مل گیا؟ کونسی عقل ان دونوں کو یکساں کہہ سکتی ہے؟ تم چاہو تو نمایشی طور پر انہیں برابر کر دو، مگر تم اس بے وقوف عورت کو وہ کفالت وحفاظت، وہ ہمدردانہ رفاقت، وہ محبت آمیز نگہداشت، وہ خیر خواہانہ دیکھ بھال، اور وہ سکینت و طمانیت کہاں سے دلواؤ گے جو صرف ایک شوہر والی عورت ہی کو مل سکتی ہے؟ تم اس کے بچے کو باپ کی شفقت اور پورے سلسلۂ پدری کی محبت وعنایت کس بازار سے لادو گے؟ زیادہ سے زیادہ تم قانون کے زور سے اس کو نفقہ دلوا سکتے ہو۔ مگر کیا ایک ماں اور ایک بچے کو دنیا میں صرف نفقہ ہی کی ضرورت ہوا کرتی ہے؟ پس یہ حقیقت ہے کہ حرام وحلال کی مادریت کو یکساں کر دینے سے گناہ کرنے والیوں کو خارجی تسلی چاہے کتنی ہی مل جائے بہر حال یہ چیز ان کو ان کی حماقت کے طبعی نتائج سے اور ان کے بچوں کو اس طرح کی پیدائش کے حقیقی نقصانات سے نہیں بچا سکتی۔

ان وجوہ سے یہ بات جماعتی زندگی کے قیام اور صحیح نشو ونما کے لیے اہم ضروریات میں سے ہے کہ جماعت میں صنفی عمل کے انتشار کو قطعی روک دیا جائے۔ اور جذباتِ شہوانی کی تسکین کے لیے صرف ایک ہی دروازہ — ازدواج کا دروازہ — کھولا جائے۔ افراد کو زنا کی آزادی دینا اُن کے ساتھ بے جا رعایت اور سوسائٹی پر ظلم، بلکہ سوسائٹی کا قتل ہے۔ جو سوسائٹی اس معاملے کو حقیر سمجھتی ہے اور زنا کو محض افراد کی خوش وقتی (Having a good time) سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہتی ہے اور ''آزادانہ تخم ریزی''

(Sowing Wild Oats) کے ساتھ رواداری برتنے کے لیے تیار ہے، وہ دراصل ایک جاہل سوسائٹی ہے۔ اس کو اپنے حقوق کا شعور نہیں ہے۔ وہ آپ اپنے ساتھ دشمنی کرتی ہے۔ اگر اسے اپنے حقوق کا شعور ہو اور وہ جانے اور سمجھے کہ صنفی تعلقات کے معاملے میں انفرادی آزادی کے اثرات جماعتی مفاد پر کیا مترتب ہوتے ہیں تو وہ اس فعل کو اُسی نظر سے دیکھے، جس سے چوری، ڈاکہ اور قتل کو دیکھتی ہے بلکہ یہ چوری سے اشد ہے۔ چور، قاتل اور ڈاکو زیادہ سے زیادہ ایک فرد یا چند افراد کا نقصان کرتے ہیں۔ مگر زانی پوری سوسائٹی پر اور اس کی آیندہ نسلوں پر ڈاکہ مارتا ہے۔ وہ بیک وقت لاکھوں کروڑوں انسانوں کی چوری کرتا ہے۔ اس کے جرم کے نتائج اِن سب مجرموں سے زیادہ دُوررس اور زیادہ وسیع ہیں۔

جب یہ تسلیم ہے کہ افراد کی خودغرضانہ دست درازیوں کے مقابلے میں سوسائٹی کی مدد پر قانون کی طاقت ہونی چاہیے، اور جب اسی بنیاد پر چوری، قتل، لوٹ مار، جعلسازی اور غصبِ حقوق کی دوسری صورتوں کو جرم قرار دے کر تعزیر کے زور سے ان کا سدِّ باب کیا جاتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ زنا کے معاملے میں قانون سوسائٹی کا محافظ نہ ہو اور اسے تعزیری جرم قرار نہ دیا جائے۔

اصولی حیثیت سے بھی یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ نکاح اور سفاح دونوں بیک وقت ایک نظامِ معاشرت کے جز نہیں ہو سکتے۔ اگر ایک شخص کے لیے ذمے داریاں قبول کیے بغیر خواہشاتِ نفس کی تسکین جائز رکھی جائے تو اسی کام کے لیے نکاح کا ضابطہ مقرر کرنا محض بے معنی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل میں بلاٹکٹ سفر کرنے کو جائز بھی رکھا جائے اور پھر سفر کے لیے ٹکٹ کا قاعدہ بھی مقرر کیا جائے۔ کوئی صاحب عقل آدمی ان دونوں طریقوں کو بیک وقت اختیار نہیں کر سکتا۔ معقول صورت یہی ہے کہ یا تو ٹکٹ کا قاعدہ سرے سے اڑا دیا جائے یا اگر یہ قاعدہ مقرر کرنا ہے تو بلاٹکٹ سفر کرنے کو جرم قرار دیا جائے۔ اسی طرح نکاح اور سفاح کے معاملے میں

دو عملی ایک قطعی غیر معقول چیز ہے۔ اگر تمدّن کے لیے نکاح کا ضابطہ ضروری ہے، جیسا کہ پہلے بدلائل ثابت کیا جاچکا ہے۔ تو اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سفاح کو جرم قرار دیا جائے۔[1]

جاہلیت کی خصوصیات میں سے یہ بھی ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ جن چیزوں کے نتائج محدود ہوتے ہیں اور جلدی اور محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں اُن کا تو ادراک کرلیا جاتا ہے مگر جن کے نتائج وسیع اور دور رس ہونے کی وجہ سے غیر محسوس رہتے ہیں اور دیر میں مترتب ہوا کرتے ہیں انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، بلکہ ناقابلِ اعتنا سمجھا جاتا ہے، چوری، قتل اور ڈکیتی جیسے معاملات کو اہم اور زنا کو غیر اہم سمجھنے کی وجہ یہی ہے۔ جو شخص اپنے گھر میں طاعون کے چوہے جمع کرتا ہے، یا متعدّی امراض پھیلاتا ہے، جاہلیت کا تمدّن اس کو تو معافی کے قابل نہیں سمجھتا، کیوں کہ اس کا فعل صریح طور پر نقصان رساں نظر آتا ہے، مگر جو زناکار اپنی خود غرضی سے تمدن کی جڑ کاٹتا ہے، اس کے نقصانات چونکہ محسوس ہونے کے بجائے معقول ہیں اس لیے وہ جاہلوں کو ہر رعایت کا مستحق نظر آتا ہے۔ بلکہ ان کی سمجھ میں یہ آتا ہی نہیں کہ اس کے فعل میں جرم کی آخر کونسی بات ہے۔ اگر تمدّن کی بنیاد جاہلیت کے بجائے عقل اور علمِ فطرت پر ہو تو یہ طرزِ عمل کبھی اختیار نہ کیا جائے۔

---

[1] ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ نکاح سے پہلے ایک جوان آدمی کو خواہشاتِ نفس کی تسکین کا تھوڑا بہت موقع ضرور حاصل ہونا چاہیے۔ کیونکہ جوانی میں جذبات کے جوش کو روکنا مشکل ہے اور اگر روکا جائے تو صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن اس نتیجے کی بنا جن مقدمات پر قائم ہے وہ سب غلط ہیں۔ جذبات کا ایسا جوش روکا نہ جاسکے ایک غیر معمولی (Abnormal) حالت ہے اور معمولی (Normal) انسانوں میں یہ حالت صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ایک غلط نظامِ تمدن ان کو زبردستی مشتعل کرتا ہے۔ ہمارے سینما، ہمارا لٹریچر، ہماری تصویریں، ہماری موسیقی اور اس مخلوط سوسائٹی میں بنی ٹھنی عورتوں کا ہر جگہ مردوں سے متصادم ہونا، یہی وہ اسباب ہیں جو خواہ مخواہ معمولی انسانوں کو شہوانی اعتبار سے غیر معمولی بنادیتے ہیں۔ ورنہ ایک پرسکون فضا میں عام مردوں اور عورتوں کو ایسا ہیجان کبھی لاحق نہیں ہوسکتا کہ ذہن اور اخلاقی تربیت سے اس کو ضبط نہ کیا جاسکے۔ اور یہ خیال کہ "جوانی کے زمانے میں صنفی عمل نہ کرنے سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے لہٰذا صحت برقرار رکھنے کے لیے زنا کرنی چاہیے" ایک مغالطے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دراصل صحت اور اخلاق دونوں کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ معاشرت کے اس غلط نظام اور خوش حال زندگی کے اُن غلط معیارات کو بدلا جائے، جن کی وجہ سے نکاح مشکل اور سفاح آسان ہو کر رہ گیا ہے۔

فاذاقضیتم مناسککم فاذکروا اللہ کذکرکم ابائکم او اشد اذکرا۔

"پھر جب تم حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ واجداد کا ذکر کرتے تھے اسی طرح اب خدا کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔"

حج کے ارکان کا مقصود ہی یہ ہے کہ آپ ان ایام میں مسلسل خدا کی یاد میں ڈوبے رہیں اور ان دنوں میں اس کی یاد اس طرح دل میں رچ بس جائے کہ پھر زندگی کی ہماہمی اور کشمکش میں کوئی چیز اس کی یاد سے آپ کو غافل نہ کر سکے۔ جاہلیت کے دور میں لوگ ارکان حج ادا کرنے کے بعد اپنے باپ کی دادا کی بڑھائی بیان کرتے اور ڈینگیں مارتے تھے۔ خدا نے ہدایت دی کہ یہ ایام خدا کی یاد میں بسر کرو اور اسی کی بڑائی کرو جو واقعی بڑا ہے۔۱۸۔ خدا کے گھر کا پروانہ وار طواف کیجیے، خدا کا ارشاد ہے:

"اور چاہیے کہ بیت اللہ کا طواف کریں۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "خدا ہر روز اپنے حاجی بندوں کے لیے ایک سو بیس رحمتیں نازل فرماتا ہے جس میں سے ساٹھ رحمتیں ان کے لیے ہوتی ہیں جو بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، چالیس ان کے لیے جو وہاں نماز پڑھتے ہیں اور بیس ان لوگوں کے لیے جو کعبے کو دیکھتے رہتے ہیں۔" (بیہقی)

اور نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا: "جس نے پچاس بار بیت اللہ کا طواف کر لیا وہ اپنے گناہوں سے ایسے پاک ہو گیا جیسے اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنم دیا ہے۔" (ترمذی)

# تزئین معاشرت

## والدین سے سلوک کے آداب

۱۔ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کیجیے اور اس حسن سلوک کی توفیق کو دونوں جہانوں کی سعادت سمجھیے، خدا کے بعد انسان پر سب سے زیادہ حق ماں باپ کا ہی ہے۔ ماں باپ کے حق کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ قرآن پاک نے جگہ جگہ ماں باپ کے حق کو خدا کے حق کے ساتھ بیان کیا ہے اور خدا کی شکر گزاری کے ساتھ ساتھ ماں باپ کی شکر گزاری کی تاکید کی ہے۔

وقضی ربك الا تعبدوا الا ایاہ و بالوالدین احسانا (بنی اسرائیل)

"اور آپ کے رب نے فیصلہ فرمادیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں: "میں نے نبی ﷺ سے پوچھا کون سا عمل خدا کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا "وہ نماز جو وقت پر پڑھی جائے۔ میں نے (پھر) پوچھا: اس کے بعد کون سا عمل خدا کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ فرمایا: ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک۔ میں پوچھا اس کے بعد، فرمایا: خدا کی راہ میں جہاد کرنا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: "میں آپ کے ہاتھ پر ہجرت اور جہاد کے لیے بیعت کرتا ہوں اور خدا سے اس کا اجر چاہتا ہوں۔ نبی ﷺ نے پوچھا: "کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی ایک زندہ ہے اس نے کہا: "جی ہاں بلکہ (خدا کا شکر ہے) دونوں زندہ ہیں "آپ نے فرمایا تو کیا تم واقعی خدا سے اپنی ہجرت اور جہاد کا بدلہ چاہتے ہو؟ اس نے کہا جی ہاں میں خدا سے اجر چاہتا ہوں، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا تو جاؤ اپنے ماں باپ کی خدمت میں رہ کر ان کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ (مسلم)

حضرت ابو مامہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے پوچھا "یا رسول اللہ ﷺ ! ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے

؟ارشاد فرمایا "ماں باپ ہی تمہاری جنت ہیں اور ماں باپ ہی دوزخ"۔ (ابن ماجہ)

یعنی ان کے ساتھ نیک سلوک کر کے تم جنت کے مستحق ہو گے اور ان کے حقوق کو پامال کر کے تم جہنم کا ایندھن بنو گے۔

۲۔ والدین کے شکر گزار رہیے۔ محسن کی شکر گزاری اور احسان مندی زارفت کا اولین تقاضا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے وجود کا محسوس سبب والدین ہیں۔ پھر والدین ہی کی پرورش اور نگرانی میں ہم پلتے بڑھتے اور شعور کو پہنچتے ہیں اور جس غیر معمولی قربانی، بے مثال جانفشانی اور انتہائی شفقت سے ہماری سرپرستی فرماتے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ ہمارا سینہ ان کی عقیدت مندی و احسان مندی اور عظمت و محبت سے سرشار ہو اور ہمارے دل کا ریشہ ریشہ ان کا شکر گزار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے اپنی شکر گزاری کے ساتھ ساتھ ان کی شکر گزاری کی تاکید فرمائی ہے۔

ان اشکرلی والوالدیك (ہم نے وصیت کی) کہ میرا شکر ادا کرو اور اپنے ماں باپ کے شکر گزار رہو۔

۳۔ ماں باپ کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کیجیے اور ان کی مرضی اور مزاج کے خلاف کبھی کوئی ایسی بات نہ کہیے

جو ان کو ناگوار ہو۔ بالخصوص بڑھاپے میں جب مزاج کچھ چڑچڑا اور کھرا ہو جاتا ہے اور والدین کچھ ایسے تقاضے اور مطالبے کرنے لگتے ہیں جو توقع کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ہر بات کو خوشی خوشی برداشت کیجیے اور ان کی کسی بات سے اکتا کر جواب میں کوئی ایسی بات ہر گز نہ کیجیے جو ان کو ناگوار ہو اور ان کے جذبات کو ٹھیس لگے

اما یبلغن عندك الکبر احدهما او کلاهما فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما۔

اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو تم ان کو اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑکیاں دو۔

دراصل بڑھاپے کی عمر میں بات کی برداشت نہیں رہتی اور کمزوری کے باعث اپنی اہمیت کا احساس بڑھ جاتا ہے، اسی لیے ذرا ذرا سی بات بھی بڑی محسوس ہونے لگتی ہے۔ لہذا اس نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے کسی قول و عمل سے ماں باپ کو ناراض ہونے کا موقع نہ دیجیے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خدا کی خوشنودی والد کی خوشنودی میں ہے اور خدا کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔ (ترمذی، ابن حبان، حاکم)

یعنی اگر کوئی اپنے خدا کو خوش رکھنا چاہے تو وہ اپنے والد کو خوش خوش رکھے، والد کو ناراض کر کے وہ خدا کے غضب کو بھڑکائے گا۔

حضرت عبداللہؓ ہی کا بیان ہے کہ ایک آدمی اپنے ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر نبی ﷺ کی خدمت میں ہجرت پر بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا "جاؤ اپنے ماں باپ کے پاس واپس جاؤ اور ان کو اسی طرح خوش کر کے آؤ جس طرح تم ان کو رلا کر آئے ہو۔" (ابو دؤد)

۴۔ دل و جان سے ماں باپ کی خدمت کیجیے۔ اگر آپ کو خدا نے اس کا موقع دیا تو دراصل یہ اس بات اس توفیق ہے کہ آپ خود کو جنت کا مستحق بنا سکیں اور خدا کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ ماں باپ کی خدمت سے ہی دونوں جہاں کی بھلائی، سعادت اور عظمت حاصل ہوتی ہے اور آدمی دونوں جہاں کی آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔

"جو آدمی چاہتا ہے کہ اس کی عمر دراز کی جائے اور اس کی روزی میں کشادگی ہو، اس کو چاہیے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے اور صلہ رحمی کرے۔ (الترغیب والترہیب)

اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے

"وہ آدمی ذلیل ہو، پھر ذلیل ہو، پھر ذلیل ہو۔ لوگوں نے پوچھا، اے خدا کے رسول ﷺ! کون آدمی؟ آپ نے فرمایا وہ آدمی جس نے اپنے ماں باپ کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، دونوں کو پایا، یا کسی ایک کو اور پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت میں داخل نہ ہوا۔" (مسلم)

ایک موقع پر تو آپ نے خدمت والدین کو جہاد جیسی عظیم عبادت پر بھی ترجیح دی اور ایک صحابی کو جہاد میں جانے سے روک کر والدین کی خدمت کی تاکید فرمائی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس جہاد میں شریک ہونے کی غرض سے حاضر ہوا۔ نبی ﷺ نے اس سے پوچھا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں۔ اس نے کہا جی ہاں زندہ ہیں۔ ارشاد فرمایا جاؤ اور ان کی خدمت کرتے رہو یہی جہاد ہے (بخاری و مسلم)

۵۔ ماں باپ کا ادب و احترام کیجیے اور کوئی بھی ایسی بات یا حرکت نہ کیجیے جو ان کے احترام کے خلاف ہو۔ قرآن میں ہے وقل لھما قولا کریما (بنی اسرائیل: ۲۳)

اوران سے احترام کی بات کیجیے۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت ابن عباس سے پوچھا کیاآپ یہ چاہتے ہیں کہ جہنم سے دور رہیں اور جنت میں داخل ہوں ؟ابن عباس نے کہا کیوں نہیں،خدا کی قسم میں یہی چاہتا ہوں۔حضرت ابن عمرؓ نے پوچھا،آپ کے والدین زندہ ہیں ؟ابن عباسؓ نے کہا جی ہاں میری والدہ زندہ ہیں۔ابن عمرؓ نے فرمایا اگر آپ ان کے ساتھ نرمی سے گفتگو کریں،ان کے کھانے پینے کا خیال رکھیں تو ضرور جنت میں جائیں گے بشرطیکہ آپ کبیرہ گناہوں سے بچتے رہیں۔(الادب المفرد)

حضرت ابوہریرہؓ نے ایک بار دو آدمیوں کو دیکھا۔ایک سے پوچھا یہ دوسرے تمہارے کون ہیں؟اس نے کہا یہ میرے والد ہیں آپ نے فرمایا دیکھو! نہ ان کا نام لینا،نہ کبھی ان سے آگے آگے چلنا اور نہ کبھی ان سے پہلے بیٹھنا۔(الادب المفرد)٦۔والدین کے ساتھ عاجزی اور انکساری سے پیش آیئے۔

واحفض لهما جناح الذل من الرحمة

"اور عاجزی اور نرمی سے ان کے سامنے بچھے رہو۔"

عاجزی سے بچھے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت ان کے مرتبہ کا لحاظ رکھو اور کبھی ان کے سامنے اپنی بڑائی نہ جتاؤ اور نہ ان کی شان میں گستاخی کرو۔

٧۔والدین سے محبت کیجیے اور اس کو اپنے لیے باعث سعادت و اجر آخرت سمجھیے۔حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ فرماتے ہیں۔

"جو نیک اولاد بھی ماں باپ پر محبت بھری نظر ڈالتی ہے،اس کے بدلے خدا اس کو ایک حج مقبول کا ثواب بخشتا ہے "لوگوں نے پوچھا اے خدا کے رسول ﷺ! اگر کوئی ایک دن میں سو بار اس طرح رحمت و محبت کی نظر ڈالے۔آپ نے فرمایا جی ہاں،اگر کوئی سو بار ایسا کرے تب،خدا (تمہارے تصور سے) بہت بڑا اور (تنگ دلی جیسے عیبوں سے) بالکل

پاک ہے۔(مسلم)

٨۔ماں باپ کی دل و جان سے اطاعت کیجیے۔اگر وہ کچھ زیادتی بھی کر رہے ہوں تب بھی خوشدلی سے اطاعت کیجیے اور ان کے عظیم احسانات کو پیش نظر رکھ کر ان کے وہ مطالبے بھی خوشی خوشی پورے کیجیے جو آپ کے ذوق اور مزاج پر گراں ہوں بشرطیکہ وہ دین کے خلاف نہ ہوں۔

حضرت ابوسعیدؓ کا بیان ہے کہ یمن کا ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔نبی ﷺ نے اس سے پوچھا:"یمن میں تمہارا کوئی ہے ؟اس نے کہا(جی ہاں) میرے ماں باپ ہیں۔آپ نے پوچھا،انہوں نے تمہیں اجازت دی ہے ؟اس نے کہا نہیں،،(میں نے ان سے تو

اجازت نہیں لی ہے)آپ ﷺ نے فرمایا:"اچھاتو تم واپس جاؤاور ماں باپ سے اجازت لو،اگر وہ اجازت دے دیں تب تو جہاد میں شرکت کرو ورنہ(ان کی خدمت میں رہ کر)ان کے ساتھ سلوک کرتے رہو۔۔"(ابوداؤد)

والدین کی اطاعت کی اہمیت کااندازہ اس بات سے کیجیے کہ ایک شخص میلوں دور سے آتا ہے اور چاہتا ہے کہ نبی ﷺ کی معیت میں دین کی سربلندی کے لیے جہاد میں شریک ہو لیکن بنی ﷺ اس کو لوٹادیتے ہیں۔اور فرماتے ہیں کہ جہاد میں شرکت بھی تم اسی صورت میں کر سکتے ہو جب تمہارے ماں باپ دونوں تمہیں اجازت دیں۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:جس آدمی نے اس حال میں صبح کی کہ وہ ان ہدایات واحکام میں خدا کا اطاعت گزار رہا ہو جو اس نے ماں باپ کے حق میں نازل فرمائے ہیں تو اس نے اس حال میں صبح کی کہ اس کے لیے جنت کے دو دروازے کھلے ہوئے ہیں اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہو تو جنت کا ایک دروازہ کھلا ہوا ہے اور جس شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ ماں باپ کے بارے میں خدا کے بھیجے ہوئے احکام وہدایات سے منہ موڑے ہوئے ہے تو اس نے اس حال میں صبح کی کہ اس کے لیے دوزخ کے دو دروازے کھلے ہوئے ہیں اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہے تو دوزخ کا ایک دروازہ کھلا ہوا ہے۔اس آدمی نے پوچھا اے خدا کے رسول ﷺ اگر ماں باپ اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہوں تب بھی۔فرمایا ہاں اگر وہ زیادتی کر رہے ہوں تب بھی،اگر زیادتی کر رہے ہوں تب بھی،اگر زیادتی کر رہے ہوں تب بھی۔(مشکوۃ)

۹۔ماں باپ کو اپنے مال کا مالک سمجھئے اور ان پر دل کھول کر خرچ کیجیے۔قرآن میں ہے:

یسئلونك ماذا ینفقون ط قل ما انفقتم من خیر فللوالدین۔(البقرہ)

"لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں،جواب دیجیے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اس کے اولین حقدار والدین ہیں۔"

ایک بار نبی ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور اپنے باپ کی شکایت کرنے لگا کہ وہ جب چاہتے ہیں میرا مال لے لیتے ہیں۔نبی ﷺ نے اس آدمی کے باپ کو بلوایا،لاٹھی ٹیکتا ہوا ایک بوڑھا کمزور شخص حاضر ہوا،آپ نے اس بوڑھے شخص سے تحقیق فرمائی تو اس نے کہنا شروع کیا:

"خدا کے رسول ﷺ ! ایک زمانہ تھا جب یہ کمزور اور بے بس تھا اور مجھ مین طاقت تھی،میں مالدار تھا اور یہ خالی ہاتھ تھا۔میں نے کبھی اس کو اپنی چیز لینے سے نہیں روکا،آج میں کمزور ہوں اور یہ تندرست و قوی ہے،میں خالی ہاتھ ہوں اور یہ مالدار ہے،اب یہ اپنا مال مجھ سے بچا بچا کر رکھتا ہے۔"

بوڑھے کی یہ بات سن کر رحمت عالم رو پڑے اور(بوڑھے کے لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر)فرمایا:تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔

۱۰۔ماں باپ اگر غیر مسلم ہوں تب بھی ان کے ساتھ سلوک کیجیے،ان کا ادب واحترام اور ان کی خدمت برابر کرتے رہیے۔البتہ وہ شرک ومعصیت کا حکم دیں تو ان کی اطاعت سے انکار کر دیجیے اور ان کا کہنا ہرگز نہ مانیے۔

وان جاھداك علی ان تشرك بی مالیس لك به علم فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفا۔

اور اگر ماں باپ دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک بناؤ جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے تو ہر گز ان کا کہنا نہ مانو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہو۔

حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ کے عہد مبارک میں میرے پاس میری والدہ آئیں اور اس وقت وہ مشرکہ تھیں۔ میں نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ میرے پاس میری والدہ آئیں ہیں اور وہ اسلام سے متنفر ہیں، کیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں تم اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرتی رہو۔ (بخاری)

۱۱۔ ماں باپ کے لیے برابر دعا بھی کرتے رہیے اور ان کے احسانات کو یاد کرکے خدا کے حضور گڑ گڑائیے اور انتہائی دل سوزی اور قلبی جذبات کے ساتھ ان کے لیے رحم و کرم کی درخواست کیجیے، خدا کا ارشاد ہے:

وقل رب ارحمھما کما ربینی صغیرا

"اور دعا کرو کہ پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما، جس طرح ان دونوں نے بچپن میں میری پرورش فرمائی تھی۔،،

یعنی اے پروردگار بچپن کی بے بسی میں، جس رحمت اور جانفشانی و شفقت و محبت سے انہوں نے میری پرورش کی اور میری خاطر اپنے عیش کو قربان کیا۔ پروردگار! میں ان کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا، تو ہی ان کی سرپرستی فرما، اور ان کے حال زار پر رحم کی نظر کر۔

۱۲۔ ماں کی خدمت کا خصوصی خیال رکھیے، ماں طبعاً زیادہ کمزور اور حساس ہوتی ہے اور آپ کے خدامت و سلوک کی نسبتاً زیادہ ضرورت مند بھی۔ پھر اس کے احسانات اور قربانیاں بھی باپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں اس لیے دین نے ماں کا حق زیادہ بتایا ہے اور ماں کے ساتھ سلوک کی خصوصی ترغیب دی ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

ووصینا الانسان بوالدیه احسانا ط حملته کرھا و وضعته کرھا وحمله وفصاله ثلثون شھرا (الاحقاف)

"اور ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنے کی تاکید کی، اس کی ماں تکلیف اٹھا اٹھا کر اس کو پیٹ میں لیے پھری اور تکلیف ہی سے جنا اور پیٹ میں اٹھانے اور دودھ پلانے کی یہ (تکلیف دہ) مدت ڈھائی سال ہے۔"

قرآن نے ماں باپ دونوں کے ساتھ سلوک کرنے کی تاکید کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ماں کے پیہم دکھ اٹھانے اور کٹھنائیاں جھیلنے کا نقشہ بڑے ہی اثر انگیز انداز میں کھینچا ہے اور نہایت ہی خوبی کے ساتھ نفسانی انداز میں اس حقیقت کی طرف اشاری کیا ہے کہ جان نثار ماں، باپ کے مقابلے میں تمہاری خدمت و سلوک کی زیادہ مستحق ہے اور پھر اسی حقیقت کو خدا کے رسول ﷺ نے بھی کھول کھول کر بیان فرمایا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں آیا اور پوچھا: "اے خدا کے رسول ﷺ میرے نیک سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "تیری ماں" اس نے پوچھا پھر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "تیری ماں" اس نے پوچھا پھر کون ہے؟ ارشاد فرمایا: "تیری ماں" اس نے کہا پھر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "تیرا باپ" (الادب المفرد)

حضرت جاہمہؓ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ میرا ارادہ ہے کہ میں آپ ﷺ کے ساتھ جہاد میں شرکت کروں اور اسی لیے آیا ہوں کہ آپ ﷺ سے اس معاملہ میں مشورہ لوں" (فرمایئے کیا حکم ہے؟) آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: "تمہاری والدہ (زندہ) ہیں؟" جاہمہؓ نے کہا: "جی ہاں" (زندہ ہیں)۔ نب ﷺ نے ارشاد فرمایا تو پھر جاؤ اور انہی کی خدمت میں لگے رہو کیونکہ جنت انہی کے قدموں میں ہے۔" (ابن ماجہ، نسائی)

حضرت اویسؓ نبی ﷺ کے دور مین موجود تھے مگر آپ ﷺ کی ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکے۔ ان کی ایک بوڑی والدہ تھیں۔ دن رات انہی کی خدمت میں لگے رہتے۔ نبی ﷺ کے دیدار کی بڑی آرزو بھی اور کون مومن ہو گا جو اس تمنا میں نہ تڑپتا ہو کہ اس کی آنکھیں دیدارِ رسول ﷺ سے روشن ہوں۔ چنانچہ حضرت اویسؓ نے آنا بھی چاہا لیکن نبی ﷺ نے منع فرمایا۔ فریضۂ حج ادا کرنے کی بھی ان کے دل میں بڑی آرزو تھی لیکن جب تک ان کی والدہ زندہ رہیں، ان کی تنہائی کے خیال سے حج نہیں کیا اور ان کی وفات کے بعد ہی یہ آرزو پوری ہو سکی۔

۱۳۔ رضاعی ماں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیجیے، اس کی خدمت کیجیے اور ادب و احترام سے پیش آیئے۔ حضرت ابو طفیلؓ کہتے ہیں میں نے جعرانہ کے مقام پر نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ گوشت تقسیم فرمارہے ہیں۔ اتنے میں ایک عورت آئیں اور نبی ﷺ کے بالکل قریب پہنچ گئیں۔ آپ ﷺ نے ان کے لیے اپنی چادر بچھادی، وہ اس پر بیٹھ گئیں۔ میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون صاحبہ ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ نبی ﷺ کی وہ ماں ہیں جنھوں نے آپ ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔ (ابو داؤد)

۱۴۔ والدین کی وفات کے بعد بھی ان کا خیال رکھیے اور ان کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے لیے مندرجہ ذیل باتوں پر کاربند رہیے:

ا)۔ ماں باپ کے لیے مغفرت کی دعائین برابر کرتے رہیے۔

قرآن پاک نے مومنوں کو یہ دعا سکھائی ہے:

ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب

"پروردگار میری مغفرت فرما اور میرے والدین کی بھی اور سب ایمان والوں کو اس روز معاف فرمادے جب کہ حساب قائم ہو گا۔"

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ مرنے کے بعد جب میت کے درجات بلند ہوتے ہیں تو وہ حیرت سے پوچھتا ہے یہ کیونکر ہوا، خدا کی طرف سے اس کو بتایا جاتا ہے کہ تمہاری اولاد تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرتی رہی (اور خدا نے اس کو قبول فرمالیا)

حضرت ابوہریرہؓ ہی کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:[

"جب کوئی آدمی مر جاتا ہے تو اس کے عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے صرف تین چیزیں ایسی ہیں جو مرنے کے بعد بھی فائدہ پہنچاتی ہیں، ایک صدقہ جاریہ، دوسرے اس کا (پھیلایا ہوا وہ) علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، تیسرے وہ صالح اولاد جو اس کے لیے دعائے مغفرت کرتی رہے۔"

۲)۔والدین کے کیے ہوئے عہد و پیمان اور وصیت کو پورا کیجیے۔ماں باپ نے اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں سے کچھ وعدے کیے ہوں گے (اپنے خدا سے کچھ عہد کیا ہو گا۔کوئی نذر مانی ہو گی، کسی کو کچھ مال دینے کا وعدہ کیا ہو گا۔ان کے ذمہ کسی کا قرضہ رہ گیا ہو گا اور ادا کرنے کا موقع نہ پاسکے ہوں گے۔مرتے وقت کچھ وصیتیں کی ہوں گی )آپ اپنے امکان بھر ان سارے کاموں کو پورا کیجیے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے نبی ﷺ سے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! میری والدہ نے نذر مانی تھی ،لیکن وہ نذر پوری کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئیں کیا میں ان کی طرف سے یہ نذر پوری کر سکتا ہوں، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کیوں نہیں! تم ضرور ان کی طرف سے نذر پوری کر دو۔

۳۔باپ کے دوستوں اور ماں کی سہیلیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتے رہیے۔ان کا احترام کیجیے۔ان کو اپنے مشوروں میں اپنے بزرگوں کی طرح شریک رکھیے۔ان کی رائے اور مشوروں کی تعظیم کیجیے۔ایک موقع پر نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے زیادہ نیک سلوک یہ ہے کہ آدمی اپنے والد کے دوست ،احباب کے ساتھ بھلائی کرے۔

ایک بار حضرت ابوالدرداءؓ بیمار ہوئے اور مرض بڑھتا ہی گیا۔یہاں تک کہ بچنے کی کوئی امید نہ رہی، تو حضرت یوسف بن عبداللہؓ دور دراز سے سفر کر کے ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گیے۔حضرت ابوالدرداءؓ نے انہیں دیکھا تو تعجب سے پوچھا تم یہاں کہاں؟ یوسف بن عبداللہؓ نے کہا میں یہاں محض اس لیے آیا ہوں کہ آپ کی عیادت کروں کیونکہ والد بزرگوار سے آپ کے تعلقات بڑے گہرے تھے۔

حضرت ابوبردہؓ فرماتے ہیں کہ جب میں مدینے آیا تو میرے پاس عبداللہ بن عمرؓ تشریف لائے اور کہنے لگے ابو بردہ! تم جانتے ہو میں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں میں نے کہا۔میں تو نہیں جانتا کہ آپ کیوں تشریف لائے ہیں۔۔اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص قبر میں اپنے باپ کے نیک سلوک کرنا چاہتا ہو تو اس کو چاہیے کہ باپ کے مرنے کے بعد باپ کے دوست احباب کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور پھر فرمایا: بھائی میرے باپ حضرت عمرؓ اور آپ کے والد گرامی میں گہری دوستی تھی۔میں چاہتا ہوں کہ اس دوستی کو نبھاؤں اور اس کے حقوق ادا کروں۔(ابن حبان)

۴۔ماں باپ کے رشتہ داروں کے ساتھ بھی برابر نیک سلوک کرتے رہیے اور رحم کے ان رشتوں کا پوری طرح پاس و لحاظ رکھیے۔ان رشتہ داروں سے بے نیازی اور بے پروائی دراصل والدین سے بے نیازی ہے۔نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا تم اپنے آباؤاجداد سے ہرگز بے پروائی نہ برتو،ماں باپ سے بے پروائی برتنا خدا کی ناشکری ہے۔

۵۔اگر زندگی میں خدانخواستہ ماں باپ کے ساتھ سلوک کرنے اور ان کے حقوق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہے تو پھر بھی خدا کی رحمت مایوس نہ ہو مرنے کے بعد ان کے حق میں برابر خدا سے دعائے مغفرت کرتے رہیے توقع ہے کہ خدا آپ کی کوتاہی سے درگزر فرمائے اور آپ کا شمار اپنے صالح بندوں میں فرمادے۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اگر کوئی بندہ خدا زندگی میں ماں باپ کا نافرمان رہا اور والدین میں سے کسی ایک کا یا دونوں کا اسی حال میں انتقال ہوگیا تو اب اس کو چاہیے کہ وہ اپنے والدین کے لیے برابر دعا کرتا رہے اور خدا سے ان کی بخشش کی درخواست کرتا رہے، یہاں کہ خدا اس کو اپنی رحمت سے نیک لوگوں میں لکھ دے۔

## ازدواجی زندگی کے آداب

اسلام جس اعلیٰ تہذیب وتمدن کا داعی ہے وہ اسی وقت وجود میں آسکتا ہے، جب ہم ایک پاکیزہ معاشرہ تعمیر کرنے میں کامیاب ہوں اور پاکیزہ معاشرے کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ آپ خاندانی نظام کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور کامیاب بنالیں خاندانی زندگی کا آغاز شوہر اور بیوی کے پاکیزہ ازدواجی تعلق سے ہوتا ہے۔اور اس تعلق کی خوشگواری اور استواری

اسی وقت ممکن ہے جب شوہر اور بیوی دونوں ہی ازدواجی زندگی کے آداب وفرائض سے بخوبی واقف بھی ہوں، اور اب آداب وفرائض کو بجا لانے کے لیے پوری دل سوزی، خلوص اور یکسوئی کے ساتھ سرگرم کار بھی رہیں، ذیل میں ہم پہلے

ان آداب وفرائض کو بیان کرتے ہیں جن کا تعلق شوہر سے ہے اور پھر ان آداب وفرائض کو جن کا تعلق بیوی سے ہے: (الف):

بیوی کے ساتھ اچھے سلوک کی زندگی گزاریئے۔اس کے حقوق کشادہ دلی کے ساتھ ادا کیجیے اور ہر معاملے میں احسان اور ایثار کی روش اختیار کیجیے خدا کا ارشاد ہے:

وعاشروھن بالمعروف

اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی گزارو

اور نبی ﷺ نے حجۃالوداع کے موقع پر ایک بہت بڑے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ہدایت فرمائی۔

"لوگو سنو! عورتوں کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آؤ، کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں، تمھین ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے کا کوئی حق نہیں۔سوائے اس صورت کے جب ان کی طرف سے کوئی کھلی ہوئی نافرمانی سامنے آئے۔اگر وہ ایسا کر بیٹھیں تو پھر خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو، اور انہیں مارو تو ایسا نہ مارنا کہ کوئی شدید چوٹ آئے۔اور پھر جب وہ تمہارے کہنے پر چلنے لگیں تو ان کو خواہ مخواہ ستانے کے بہانے نہ ڈھونڈو۔دیکھو سنو! تمہارے کچھ حقوق تمہاری بیویوں پر ہیں اور تمہاری بیویوں کے کسچھ حقوق تمہارے اوپر ہیں۔ان

پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو ان لوگوں سے نہ روندوائیں جن کو تم پر یہ ضق ہے کہ تم انہیں اچھا کھلاؤ اور اچھا پہناؤ۔"(ریاض الصالحین)

یعنی ان کے کھلانے پلانے کا ایسا انتظام کیجیے جو زوجین کی بے مثال قربت، قلبی تعلق اور جذبۂ رفاقت کے شایان شان ہو۔

۲۔ جہاں تک ہو سکے بیوی سے خوس گمان رہیے اور اس کے ساتھ نبا کرنے میں تحمل، بردباری اور دالی ظرفی کی روش اختیار کیجیے، اگر اس میں شکل و صورت، عادات و اطوار یا سلیقہ اور ہنر کے اعتبار سے کوئی کمزوری ہو تو صبر کے ساتھ اس کو برداشت کیجیے اور اس کی خوبیوں پر نگاہ رکھتے ہوئے فیاضی، در گزر، ایثار اور مصلحت سے کام لیجیے، خدا کا ارشاد ہے:

والصلح خیر

"اور مصالحت خیر ہی خیر ہے۔"

اور مومنین کو ہدایت کی گئی ہے:

فان کرھتموھن فعسی ان تکرھوا شیئا و یجعل اللہ خیرا کثیرا۔(سورہ النساء ۱۹)

"پھر اگر وہ تمہیں (کسی وجہ سے) ناپسند ہوں، تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر خدا نے اس میں (تمہارے لیے) بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔"

اسی مفہوم کو نبی ﷺ کے ایک حدیث میں یوں واضح فرمایا ہے:

"کوئی مومن اپنی مومنہ بیوی سے نفرت نہ کرے، اگر بیوی کی کوئی عادت اس کو ناپسند ہے تو ہو سکتا ہے کہ دوسری خصلت اس کو پسند آجائے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ہر خاتون میں کسی نہ کسی پہلو سے کوئی کمزوری ضرور ہو گی اور اگر شوہر کسی عیب کو دیکھتے ہی اس کی طرف سے نگاہیں پھیر لے اور دل برا کر لے تو پھر کسی خاندان میں گھریلو خوشگواری مل ہی نہ سکے گی۔ حکمت کی روش یہی ہے کہ آدمی در گزر سے کام لے اور خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے عورت کے ساتھ خوش دلی کے ساتھ بنا کرنے کی کوشش کرے۔ ہو سکتا ہے کہ خدا اس عورت کے واسطے سے اس مرد کو کچھ بلائیوں سے نوازے جن تک مرد کی کوتاہ نظر نہ پہنچ رہی ہو۔ مثلاً عورت میں دین و ایمان اور سیرت و اخلاق کی کچھ ایسی خوبیاں ہوں، جن کے باعث وہ پورے خاندان کے لیے رحمت ثابت ہو، یا اس کی ذات سے کوئی ایسی روح سعید وجود میں آئے جو ایک عالم کو فائدہ پہنچائے اور رہتی زندگی تک کے لیے باپ کے حق میں صدقہ جاریہ بنے یا عورت مرد کی اصلاح حال کا ذریعہ بنے اور اس کو جنت سے قریب کرنے میں مددگار ثابت ہو، یا پھر اس کی قسمت سے دنیا میں خدا اس مرد کو کشادہ روزی اور خوش حالی سے نوازے۔ بہر حال عورت کے کسی

ظاہری عیب کو دیکھ کر بے صبری کے ساتھ ازدواجی تعلق کو برباد نہ کیجیے بلکہ حکیمانہ طرزِ عمل سے دھیرے دھیرے گھر کی فضا کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانے کی کوشش کیجیے۔

۳۔ عفو و کرم کی روش اختیار کیجیے اور بیوی کی کوتاہیوں، نادانیوں اور سرکشیوں سے چشم پوشی کیجیے۔ عورت عقل و خرد کے اعتبار سے کمزور اور نہایت ہی جذباتی ہوتی ہے، اس لیے صبر و سکون، رحمت و شفقت اور دل سوزی کے ساتھ اس کو سدھارنے کی کوشش کیجیے اور صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے نباہ کیجیے۔

خدا کا ارشاد ہے:

یایھا الذین آمنوا ان من ازواجکم و اولادکم فاحذروھم و ان تعفوا و تصفحوا و تغفروا فان اللہ غفور الرحیم۔ (التغابن ۱۴)

"مومنو! تمہاری بعض بیویاں اور بعض اولاد تمہارے دشمن ہیں۔ سو ان سے بچے رہو، اور اگر تم عفو و کرم، در گزر اور چشم پوشی سے کام لو تو یقین رکھو کہ خدا بہت ہی زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلیوں میں سب سے زیادہ اوپر کا حصہ ٹیڑھا ہے، اس کو سیدھا کرو گے تو ٹوٹ جائے گی اور اس کو چھوڑے رہو تو ٹیڑی ہی رہے گی۔ پس عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔" (بخاری، مسلم)

۴۔ بیوی کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کیجیے اور پیار و محبت سے پیش آیئے نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"کامل ایمان والے مومن وہ ہیں جو اپنے اخلاق میں سب سے اچھے ہوں اور تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں سب سے اچھے ہوں۔" (ترمذی)

اپنی خوش اخلاقی اور نرم مزاجی کو جانچنے کا اصل میدان گھریلو زندگی ہے گھر والوں ہی سے ہر وقت کا واسطہ رہتا ہے اور گھر کی بے تکلف زندگی میں ہی مزاج اور اخلاق کا ہر رخ سامنے آتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ وہی مومن اپنے ایمان میں کامل ہے جو گھر والوں کے ساتھ خوش اخلاق، خندہ پیشانی اور مہربانی کا برتاؤ رکھے۔ گھر والوں کی دلجوئی کرے اور پیار و محبت سے پیش آئے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نبی ﷺ کے یہاں گڑیوں سے کھلا کرتی تھی اور میری سہیلیاں بھی میرے ساتھ کھلتیں، جب نبی ﷺ تشریف لاتے تو سب ادھر ادھر چھپ جاتیں۔ آپ ﷺ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک کو میرے پاس بھیجتے تا کہ میرے ساتھ کھیلیں۔" (بخاری، مسلم)

ایک بار حج کے موقع پر حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیٹھ گیا اور وہ سب سے پیچھے رہ گئی۔ نبی ﷺ نے دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہی ہیں۔ آپ ﷺ رک گئے اور اپنے دستِ مبارک سے چادر کا پلو لے کر ان کے آنسو پونچھے۔ آپ ﷺ آنسو پونچھتے جاتے تھے اور وہ بے اختیار روتی جاتی تھیں۔

۵۔ پوری فراخ دلی کے ساتھ رفیقۂ حیات کی ضرورت فراہم کیجیے اور خرچ میں کبھی تنگی نہ کیجیے۔ اپنی محنت کی کمائی گھر والوں پر صرف کر کے سکون و مسرت کیجیے۔ کھانا کپڑا بیوی کا حق ہے اور اس حق کو خوش دلی اور کشادگی کے ساتھ ادا کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنا شوہر کا انتہائی خوشگوار فریضہ ہے، اس فریضے کو کھلے دل سے انجام دینے سے نہ صرف دنیا میں خوشگوار ازدواجی زندگی کی نعمت ملتی ہے، بلکہ مومن آخرت میں بھی اجر و ثواب کا مستحق بنتا ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"ایک دینار تو وہ ہے جا تم نے خدا کی راہ میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تم نے غلام کو آزاد کرانے میں صرف کیا۔ ایک دینار وہ ہے جو تم نے کسی فقیر کو دیا اور ایک دینار وہ ہے جو تم نے اپنے گھر والوں پر صرف کیا۔ ان میں سب سے زیادہ اجر و ثواب اس دینار کے خرچ کرنے کا ہے جو تم نے اپنے گھر والوں پر صرف کیا ہے۔" (مسلم)

۶۔ بیوی کو دینی احکام اور تہذیب سکھائیے۔ دین کی تعلیم دیجیے۔ اسلامی اخلاق سے آراستہ کیجیے اور اس کی تربیت اور سدھار کے لیے، ہر ممکن کوشش کیجیے تاکہ وہ ایک اچھی بیوی، اچھی ماں اور خدا کی نیک بندی بن سکے اور اپنے منصبی فرائض کو بحسن وخوبی ادا کر سکے۔ خدا کا ارشار ہے:

یایھا الذین امنوا قوا انفسکم و اھلیکم ناراً

"ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔"

نبی ﷺ جس طرح باہر تبلیغ و تعلیم میں مصروف رہتے تھے۔ اسی طرح گھر میں بھی اس فریضے کو ادا کرتے رہتے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے نبی ﷺ کی بیویوں کو خطاب کیا ہے۔

"اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو۔"

قرآن میں نبی ﷺ کے واسطے سے مومنوں کو ہدایت کی گئی ہے۔

وامر اھلك بالصلوٰۃ و اصطبر علیھا

"اور اپنے گھر والوں کو نماز کی تاکید کیجیے اور خود بھی اس کے پورے پابند رہیے۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"جب کوئی مرد رات کو اپنی بیوی کو جگاتا ہے اور وہ دونوں مل کر دو رکعت نماز پڑھتے ہیں تو شوہر کا نام ذکر کرنے والوں میں اور بیوی کا نام ذکر کرنے والیوں میں لکھ لیا جاتا ہے۔" (ابوداؤد)

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ شب کو خدا کے حضور کھڑے عبادت کرتے رہتے پھر جب سحر کا وقت آتا تو اپنی رفیقہَ حیات کو جگاتے اور کہتے اٹھو اٹھو نماز پڑھو، اور پھر یہ آیت بھی پڑھتے:

وامر اھلك بالصلوٰة واصطبر علیھا

۷۔ اگر کئی بیویاں ہوں تو سب کے ساتھ برابری کا سلوک کیجیے۔ نبی ﷺ بیویوں کے ساتھ برتاؤ میں برابری کا بڑا اہتمام فرماتے۔ سفر پر جاتے تو قرعہ نکالتے اور قرعہ میں جس بیوی کا نام اتا اسی کو ساتھ لے جاتے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں اور اس نے ان کے ساتھ انصاف اور برابری کا سلوک نہ کیا تو قیامت کے روز وہ شخص اس حال میں آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ گر گیا ہو گا۔" (ترمذی)

انصاف اور برابری سے مراد، معاملات اور برتاؤ میں مساوات برتنا ہے۔ رہی یہ بات کہ کسی ایک بیوی کی طرف دل کا جھکاؤ اور محبت کے جذبات زیادہ ہوں تو یہ انسان کے بس میں نہیں ہے اور اس پر خدا کے یہاں کوئی گرفت نہ ہو گی۔

۸۔ خواتین نہایت خوش دلی کے ساتھ اپنے شوہر کی اطاعت کیجیے اور اس اطاعت میں مسرت اور سکون محسوس کیجیے، اس لیے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور جو بندی خدا کے حکم کی تعمیل کرتی ہے وہ اپنے خدا کو خوش کرتی ہے۔ قرآن میں ہے:

فالصالحت قانتات

"نیک بیویاں (شوہر کی) اطاعت کرنے والی ہوتی ہیں۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"کوئی عورت شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے۔" (ابوداؤد)

شوہر کی اطاعت اور فرماں داری کی اہمیت واضح کرتے ہوئے نبی ﷺ نے عورت کو تنبیہ کی ہے:

"دو قسم کے آدمی وہ ہیں جن کی نمازیں ان کے سروں سے اونچی نہیں اٹھتیں......... اس غلام کی نماز جو اپنے آقا سے فرار ہو جائے جب تک لوٹ نہ آئے اور اس عورت کی نماز جو شوہر کی نافرمانی کرے جب تک کہ شوہر کی نافرمانی سے باز نہ آجائے۔" (الترغیب والترہیب)

۹۔اپنی آبرو اور عصمت کی حفاظت کا اہتمام کیجیے اور ان تمام باتوں اور کاموں سے بھی دور رہیے جن سے دامن عصمت پر دھبہ لگنے کا اندیشہ بھی ہو، خدا کی ہدایت کا تقاضا بھی یہی ہے اور ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنائے رکھنے کے لیے بھی یہ انتہائی ضروری ہے۔اس لیے کہ اگر شوہر کے دل میں اس طرح کا کوئی شبہ پیدا ہو جائے تو عورت کی کوئی خدمت و اطاعت اور کوئی بھلائی شوہر کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتی اور اس معاملہ میں معمولی سی کوتاہی سے بھی شوہر کے دل میں شیطان شبہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔لہذا انسانی کمزوری کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انتہائی احتیاط کیجیے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"عورت جب پانچوں وقت کی نماز پڑھے،اپنی آبرو کی حفاظت کرے،اپنے شوہر کی فرمانبردار رہے تو وہ جنت میں جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔(الترغیب والترہیب)

۱۰۔شوہر کی اجازت اور مرضی کے بغیر باہر نہ جاییے اور نہ ایسے گھروں میں جاییے جہاں شوہر آپ کا جانا پسند نہ کرے اور نہ ایسے لوگوں کو اپنے گھر میں آنے کی اجازت دیجیے جن کا آنا شوہر کو ناگوار ہو۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"خدا پر ایمان رکھنے والی عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں کسی ایسے شخص کو آنے کی اجازت دے جس کا آنا شوہر کو ناگوار ہو،اور وہ گھر سے ایسی صورت میں نکلے جب کہ اس کا نکلنا شوہر کو ناگوار ہو اور عورت شوہر کے معاملے میں کسی دوسرے کا کہنا مانے۔"(الترغیب والترتیب)

یعنی شوہر کے معاملے میں شوہر کی مرضی اور اشارۂ چشم وابرو ہی پر عمل کیجیے اور اس کے خلاف ہرگز دوسروں کے مشورے کو نہ اپنایئے۔

۱۱۔ہمیشہ اپنے قول و عمل اور انداز و اطوار سے شوہر کو خوش رکھنے کی کوشش کیجیے۔کامیاب ازدواجی زندگی کا راز بھی یہی ہے اور خدا کی رضا اور جنت کے حصول کا راستہ بھی یہی ہے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"جس عورت نے بھی اس حالت میں انتقال کیا کہ اس کا شوہر اس سے راضی اور خوش تھا تو وہ جنت میں داخل ہو گی۔"(ترمذی)

نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

"جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو جنسی ضرورت کے لیے بلائے اور وہ نہ آئے اور اس بناء پر شوہر رات بھر اس سے خفا رہے تو ایسی عورت پر صبح تک فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں۔"(بخاری،مسلم)

۱۲۔اپنے شوہر سے محبت کیجیے اور اس کی رفاقت کی قدر کیجے۔ یہ زندگی کی زینت کا سہارا اور راہ حیات کا عظیم معین و مددگار ہے۔ خدا کی اس عظیم نعمت پر خدا کا بھی شکر ادا کیجیے اور اس نعمت کی بھی دل و جان سے قدر کیجیے۔ نبی ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

"نکاح سے بہتر کوئی چیز دو محبت کرنے والوں کے لیے نہیں پائی گئی۔"

حضرت صفیہؓ کو نبی ﷺ سے انتہائی محبت تھی۔ چنانچہ جب آپ ﷺ بیمار ہوئے تو انتہائی حسرت کے ساتھ بولیں: "کاش آپ ﷺ کے بجائے میں بیمار ہوتی۔" نبی ﷺ کی دوسری بیویوں نے اس اظہار محبت پر تعجب سے ان کی طرف دیکھا تو نبی ﷺ نے فرمایا: "دکھاوا نہیں ہے بلکہ سچ کہہ رہی ہیں۔"

۱۳۔شوہر کا احسان مانیے اس کی شکر گزار رہیے۔ آپ کا اب سے بڑا محسن آپ کا شوہر ہی تو ہے جو ہر طرح آپ کو خوش کرنے میں لگا رہتا ہے، آپ کی ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے، اور آپ کو ہر طرح کا آرام پہنچا کر آرام محسوس کرتا ہے۔

حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ ایک بار نبی ﷺ میرے پاس سے گزرے میں اپنی پڑوسن سہیلیوں کے ساتھ تھی۔ آپ ﷺ نے ہمیں سلام کیا، اور ارشاد فرمایا: "تم پر جن کا احسان ہے ان کی ناشکری سے بچو۔ تم میں سے کوئی ایک اپنے ماں باپ کے یہاں کافی دنوں تک بن بیاہی بیٹھی رہتی ہے پھر خدا اس کو شوہر عطا فرماتا ہے پھر خدا اس کو اولاد سے نوازتا ہے (ان تمام احسانات کے باوجود) اگر کبھی کسی بات پر شوہر سے خفا ہوتی ہے تو کہہ اٹھتی ہے۔ میں نے تو کبھی تمہاری طرف سے کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں۔" (الادب المفرد)

ناشکر گزار اور احسان فراموش بیوی کو تنبیہ کرتے ہوئے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خدا قیامت کے روز اس عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا، جو شوہر کی ناشکر گزار ہوگی حالانکہ عورت کسی وقت بھی شوہر سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔" (نسائی)

۱۴۔شوہر کی خدمت کر کے خوشی محسوس کیجیے اور جہاں تک ہو سکے خود تکلیف اٹھا کر شوہر کو آرام پہنچایئے اور ہر طرح اس کی خدمت کر کے اس کا دل اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کیجیے۔ حضرت عائشہؓ اپنے ہاتھ سے نبی ﷺ کے کپڑے دھوتیں، سر میں تیل لگاتیں، کنگھا کرتیں، خوشبو لگاتیں اور یہی حال دوسری صحابیہؓ خواتین کا بھی تھا۔

ایک بات نبی ﷺ نے فرمایا:

"کسی انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو سجدہ کرے۔ اگر اس کی اجازت ہوتی تو بیوی کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے، شوہر کا اپنی بیوی پر عظیم حق ہے، اتنا عظیم حق کہ اگر شوہر کا سارا جسم زخمی ہو اور بیوی شوہر کے زخمی جسم کو چاٹے تب بھی شوہر کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔" (مسند احمد)

۱۵۔شوہر کے گھر اور مال و اسباب کی حفاظت کیجیے، شادی کے بعد شوہر کے گھر ہی کو اپنا گھر سمجھیے اور شوہر کے مال کو شوہر کے گھر کی رونق بڑھانے، شوہر کی عزت بنانے اور اس کے بچوں کا مستقبل سنوارنے میں حکمت اور کفایت و سلیقے سے خرچ کیجیے، شوہر کی ترقی اور خوشحالی کو اپنی ترقی اور خوشحالی سمجھیے۔ قریش کی عورتوں کی تعریف کرتے ہوئے نبی ﷺ نے فرمایا:

"قریش کی عورتیں کیا ہی خوب عورتیں ہیں۔ بچوں پر نہایت مہربان ہیں، اور شوہر کے گھر بار کی انتہائی حفاظت کرنے والی ہیں۔" (بخاری)

اور نبی ﷺ نے نیک بیوی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"مومن کے لیے خوفِ خدا کے بعد سب سے زیادہ مفید اور باعثِ خیر نعمت نیک بیوی ہے کہ جب وہ اس سے کسی کام کو کہے تو وہ خوش دلی سے انجام دے اور جب وہ اس پر نگاہ ڈالے تو وہ اس کو خوش کر دے، اور جب وہ اس کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے، اور جب وہ کہیں چلا جائے تو وہ اس کے پیچھے اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کرے اور شوہر کے مال واسباب کی نگرانی میں شوہر کی خیر خواہ اور وفادار رہے۔ (ابن ماجہ)

۱۶۔ صفائی، سلیقہ اور آرائش وزیبائش کا بھی پورا اہتمام کیجیے۔ گھر کو بھی صاف ستھرا رکھیے اور ہر چیز کو سلیقے سے سجائیے اور سلیقے سے استعمال کیجیے، صاف ستھرا گھر، قرینے سے سجے ہوئے صاف ستھرے کمرے، گھریلو کاموں میں سلیقہ اور سگھڑ پن، بناؤ سنگھار کی ہوئی بیوی کی پاکیزہ مسکراہٹ سے نہ صرف گھریلو زندگی، پیار و محبت اور خیر و برکت سے مالا مال ہوتی ہے، بلکہ ایک بیوی کے لیے اپنی عاقبت بنانے اور خدا کو خوش کرنے کا بھی یہی ذریعہ ہے۔

ایک بار بیگم عثمان بن مظعونؓ سے حضرت عائشہؓ کی ملاقات ہوئی تو آپؓ نے دیکھا کہ بیگم عثمان نہایت سادہ کپڑوں مین ہیں اور اور کوئی بناؤ سنگھار بھی نہین کیا ہے تو حضرت عائشہؓ کو بہت تعجب ہوا اور ان سے پوچھا:

"بی بی! کیا عثمان کہیں باہر سفر پر گئے ہوئے ہیں؟"

اس تعجب سے اندازہ کیجیے کہ سہاگنوں کا اپنے شوہروں کے لیے بناؤ سنگھار کیسا پسندیدہ فعل ہے۔

ایک بار ایک صحابیہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں وہ اپنے ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھیں، آپ ﷺ نے ان کو پہننے سے منع فرمایا تو کہنے لگیں:

یارسول اللہ ﷺ! اگر عورت شوہر کے لیے بناؤ سنگھار نہ کرے گی تو اس کی نظروں سے گر جائے گی۔ (نسائی)

## اولاد کی پرورش کے آداب

۱۔ اولاد کو خدا کا انعام سمجھیے، ان کی پیدائش پر خوشی منایئے ایک دوسرے کو مبارکباد دیجیے خیر و برکت کی دعاؤن کے ساتھ استقبال کیجیے، اور خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے آپ کو اپنے ایک بندے کی پرورش کی توفیق بخشی اور یہ موقع فراہم فرمایا کہ آپ اپنے پیچھے اپنے دین و دنیا کا جانشین چھوڑ جائیں۔

۲۔اولاد نہ ہو تو خدا سے صالح اولاد کے لیے دعا کیجیے، جس طرح خدا کے برگزیدہ پیغمبر حضرت زکریا علیہ السلام نے صالح اولاد کے لیے دعا فرمائی:

"رب هب لی من لدنك ذرية انك سميع الدعاء۔(آل عمران)

"میرے رب! تو اپنے پاس سے مجھے پاک باز اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔"

۳۔اولاد کی پیدائش پر کبھی دل تنگ نہ ہوں، معاشی تنگی صحت کی خرابی یا کسی اور وجہ سے اولاد کی پیدائش پر کڑھنے یا اس کو اپنے حق میں ایک مصیبت سمجھنے سے سختی کے ساتھ پرہیز کیجیے۔

۴۔اولاد کو کبھی ضائع نہ کیجیے، پیدا ہونے سے پہلے یا پیدا ہونے کے بعد اولاد کو ضائع کرنا بدترین سنگ دلی، بھیانک ظلم، انتہائی بزدلی اور دونوں جہان کی تباہی ہے۔ خدا کا ارشاد ہے:

قد خسر الذين قتلوا اولادهم سفها بغير علم (الانعام)

"وہ لوگ انتہائی گھاٹے میں ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو نا سمجھی میں اپنی حماقت سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

اور خدا نے انسانی کوتاہ نظری کا دل نشیں جواب دیتے ہوئے صاف صاف ممانعت فرمائی ہے کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔"

ولا تقتلوا اولادكم خشية املاق نحن نرزقهم و اياكم ان قتلهم كان خطا كبيرا۔(بنی اسرائیل)

"اور اپنی اولاد کو فقر و فاقے کے خوف سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور ہم ہی تمہیں بھی رزق دے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اولاد کا قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔"

ایک بار ایک صحابی نے دریافت کیا، یا رسول اللہ ﷺ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا۔ "شرک" پوچھا اس کے بعد، فرمایا: "والدین کی نافرمانی"، پھر پوچھا اس کے بعد، فرمایا: "تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔"

۵۔ولادت کے وقت ولادت والی عورت کے پاس آیۃ الکرسی اور سورۃ الاعراف کی نیچے لکھی ہوئی دو آیتوں کی تلاوت کیجیے اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ پڑھ کر دم کیجیے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

"خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ زندہ وجاوید، نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے نہ وہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ آتی ہے۔آسمانون اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور انسان اس کے علم میں سے کسی بات کا بھی احاطہ نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ جتنا علم وہ خود انسان کو دینا چاہے، اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی حفاظت و نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہین۔وہ بڑا ہی بلند مرتبہ اور صاحب عظمت ہے۔"

سورہ اعراف کی دو آیتیں یہ ہیں:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۗ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (الاعراف:۵۴۔۵۵)

"حقیقت یہ ہے کہ خدا ہی تمہارا پروردگار ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر اپنے تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوا۔ وہی رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے اور پھر دن، رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے، اسی نے سورج، چاند و تارے پیدا کیے جو اسکے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں، سن رکھو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کا حق ہے حکم دینا۔ پس کیا ہی برکت والا ہے خدا سارے جہانوں کا مالک اور پروردگار، اپنے رب کو پکارو گڑ گڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، بے شک وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

۶۔ولادت کے بعد نہلا دھلا کر دائیں کان میں آذان اور بائیں کان میں اقامت کہیے جب حضرت حسینؓ کی ولادت ہوئی تو نبی ﷺ نے ان کے کان میں آذان واقامت فرمائی۔(طبرانی)

اور نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جس کے یہاں بچے کی ولادت ہو اور وہ اس بچے کے دائیں کان میں آذان اور بائیں کان میں اقامت کہے تو بچہ ام الصبیان ای کی تکلیف سے محفوظ رہے گا۔(ابویعلی ابن سنی)

پیدا ہوتے ہی بچے کے کان میں خدا اور رسول ﷺ کا نام پہنچانے میں بڑی حکمت ہے، علامہ ابن قیم اپنی کتاب "تحفۃ الودود" میں فرماتے ہیں:

"اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے کان میں سب سے پہلے اللہ تعالٰی کی عظمت اور کبریائی کی آواز پہنچے اور جس شہادت کو وہ شعوری طور پر ادا کرنے کے بعد داخل اسلام ہو گا اس کی تلقین پیدائش کے دن ہی سے کی جائے۔ جس طرح مرنے کے وقت اس کو کلمۂ توحید کی تلقین کی جاتی ہے، آذان اور اقامت کا دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ شیطان جو گھات میں بیٹھا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ پیدا ہوتے ہی انسان کو آزمائش میں مبتلا کرے آذان سنتے ہی بھاگ جاتا ہے اور شیطان کی دعوت سے پہلے بچے کو اسلام اور عبادت الٰہی کی دعوت دے دی جاتی ہے۔

۷۔آذان واقامت کے بعد کسی نیک مرد یا عورت سے کھجور چبوا کر بچے کے تالو میں لگوایئے اور بچے کے لیے خیر و برکت کی دعا کرایئے۔
حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ عبداللہ بن زبیرؓ جب پیدا ہوئے تو میں نے ان کو نبی ﷺ کی گود میں دیا۔آپ ﷺ نے خرما منگوایا اور چبا کر لعاب مبارک عبداللہ بن زبیرؓ کے منہ میں لگادیا اور خرما ان کے تالو میں ملا اور خیر و برکت کی دعا فرمائی۔

۱ مرگی جو بچوں کو فاسد ہوا لگنے سے ہو جاتی ہے اور بچے اس مرض میں بے ہوش ہو جاتے ہیں

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ کے یہاں بچے لائے جاتے تھے۔آپ ﷺ تحنیک۱ فرماتے اور ان کے حق میں دعا کرتے۔"(مسلم)

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی تو آپ نے اس کی تحنیک کے لیے مکے کی کھجور منگوائی جو اپ کے گھر میں موجود تھی اور ایک نیک بی بی ام علیؒ سے تحنیک کے لیے درخواست کی۔

۸۔بچے کے لیے اچھا سا نام تجویز کیجیے جو یا تو پیغمبروں کے نام پر ہو یا خدا کے نام سے پہلے عبد لگا کر ترکیب دیا گیا ہو جیسے عبداللہ، عبدالرحمن وغیرہ۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "قیامت کے روز تمہیں اپنے اپنے ناموں سے پکارا جائے گا،اس لیے بہتر نام رکھا کرو۔"(ابو دؤود)

اور نبی ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ خدا کو تمہارے ناموں میں سے عبداللہ اور عبدالرحمن سب سے زیادہ پسند ہیں اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ انبیاء کے ناموں پر نام رکھو۔

اور بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میرے نام پر نام رکھو میری کنیت پر مت رکھو۔"

۹۔اگر کبھی لاعلمی میں غلط نام رکھ دیا ہو تو اس کو بدل کر اچھا نام رکھ دیجیے۔نبی ﷺ غلط نام کو بدل دیا کرتے تھے، حضرت عمرؓ کی ایک صاحبزادی کا نام عاصیہ تھا۔آپ ﷺ نے بدل کر جمیلہ رکھ دیا۔(مسلم)

حضرت زینب، ابو سلمہؓ کی بیٹی ہیں، ان کا نام برہ تھا، برہ کے معنی ہیں پاکباز، نبی ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا خود ہی اپنی پاکبازی کا دم بھرتی ہو، لوگوں نے کہا پھر کیا نام رکھیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: 'زینب نام رکھو۔"(ابوداؤد)

۱۰۔ساتویں دن عقیقہ کیجیے۔لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا کیجیے۔لیکن لڑکے کی طرف سے دو بکرے کرنا ضروری نہیں ہے۔ایک بکرا بھی کر سکتے ہیں اور بچے کے بال منڑوا کر اس کے برابر سونا یا چاندی خیرات کیجیے۔نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

ساتویں روز بچے کا نام تجویز کیا جائے اور اس کے بال اتروا کر اس کی طرف سے عقیقہ کیا جائے۔"(ترمذی)

۱۱۔ساتویں دن ختنہ بھی کرادیجیے، لیکن کسی وجہ سے نہ کرائیں تو سات سال کی عمر کے اندر اندر ضرور کرادیں، ختنہ اسلامی شعار ہے۔

۱۲۔جب بچہ بولنے لگے تو سب سے پہلے اسے کلمہ "لاالہ الااللہ" سکھایئے۔نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔

"جب تمہاری اولاد بولنے لگے تو اس کو"لاالہ الااللہ" سکھادو، پھر مت پرواکرو کہ کب مرے اور جب دودھ کے دانت گر جائیں تو نماز کا حکم دو۔"(نسائی)

اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کے خاندان میں جب کسی بچے کی زبان کھل جاتی تو آپ ﷺ اس کو سورۃ الفرقان کی دوسری آیت سکھاتے، جس میں توحید کی پوری تعلیم کو بری خوبی کے ساتھ سمیٹ دیا گیا ہے۔

الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ﴿۲﴾

"وہ خدا جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک

[۱] کھجور وغیرہ کو چبا کر خوب نرم کرکے بچے کے تالو میں لگانے کو تحنیک کہتے ہیں۔

نہیں ہے، جس نے ہر چیز کی تخلیق کی اور پھر اس کی موزوں تقدیر مقرر فرمائی۔"

۱۳۔بچے کو اپنا دودھ بھی پلایئے، ماں پر بچے کا یہ حق ہے، قرآن نے اولاد کو ماں کا یہی احسان یاد دلا کر ماں کے ساتھ غیر معمولی سلوک کی تاکید کی ہے۔ماں کا فرض یہ ہے کہ وہ بچے کو اپنے دودھ کے ایک ایک قطرے کے ساتھ توحید کا درس، رسول ﷺ کا عشق اور دین کی محبت بھی پلائے اور اس محبت کو اس کے قلب وروح میں بسانے کی کوشش کرے۔پرورش کرے۔پرورش کی ذمہ داری بابا پر ڈال کر اپنا بوجھ ہلکا نہ کیجیے بلکہ اس خوشگوار دینی فریضے کو انجام دے کر روحانی سکون اور سرور محسوس کیجیے۔

۱۴۔بچوں کو ڈرانے سے پرہیز کیجیے۔ابتدائی عمر کا یہ ڈر ساری عمر ذہن ودماغ پر چھایا رہتا ہے اور ایسے بچے بالعموم زندگی میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کے لائق نہیں رہتے۔

۱۵۔اولاد کو بات بات پر ڈانٹنے، جھڑکنے اور برا بھلا کہنے سے سختی کے ساتھ پرہیز کیجیے اور ان کی کوتاہیوں پر بیزار ہونے اور نفرت کا اظہار کرنے کی بجائے حکمت وسوز کے ساتھ ان کی تربیت کرنے کی محبت آمیز کوشش کیجیے اور اپنے طرز عمل سے بچوں کے ذہن پر یہ خوف بہر حال غالب رکھیے کہ ان کی کوئی خلاف شرع بات آپ ہر گز برداشت نہ کریں گے۔

۱۶۔اولاد کے ساتھ ہمیشہ، شفقت، محبت، نرمی کا برتاؤ کیجیے اور حسب ضرورت وحیثیت ان کی ضروریات پوری کرکے ان کو خوش رکھیے اور اطاعت وفرمانبرداری کے جذبات ابھاریئے۔

ایک بار حضرت امیر معاویہؓ نے احنف بن قیسؓ سے پوچھا، کہیے اولاد کے سلسلے میں کیا سلوک ہونا چاہیے۔احنیف بن قیسؓ نے کہا:

"امیر المومنین! اولاد ہمارے قلوب کا ثمرہ ہیں، کمر کی ٹیک ہیں، ہماری حیثیت ان کے لیے زمین کی طرح ہے جو نہایت نرم اور بے ضرر ہے اور ہمارا وجود ان کے لیے سایہ فگن آسمان کی طرح ہے اور ہم انہی کے زریعہ بڑے بڑے کام انجام دینے کی ہمت کرتے ہیں۔ پس اگر وہ آپ سے کچھ مطالبہ کریں تو ان کو خوب دیجیے اور اگر کبھی گرفتہ دل ہوں تو ان کے دلوں کا غم دور کیجیے۔ نتیجہ میں وہ آپ سے محبت کریں گے، آپ کی پدرانہ کوششوں کو پسند کریں گے اور کبھی ان پر ناقابل برداشت بوجھ نہ بنیے کہ وہ آپ کی زندگی سے اکتا جائیں اور آپ کی موت کے خواہاں ہوں، آپ کے قریب آنے سے نفرت کریں۔"

حضرت امیر معاویہؓ، یہ حکیمانہ باتیں سن کر بہت متاثر ہوئے اور فرمایا:

"احنیف! خدا کی قسم جس وقت آپ میرے پاس آکر بیٹھے، میں یزید کے خلاف غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔"

پھر جب حضرت احنیف تشریف لے گئے تو حضرت امیر معاویہؓ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور یزید سے راضی ہو گئے اور اسی وقت یزید کو دو سو درہم اور دو سو جوڑے بھجوائے۔ یزید کے پاس جب یہ تحفے پہنچے تو یزید نے یہ تحفے دو برابر برابر حصوں میں تقسیم کر کے سو درہم اور سو جوڑے حضرت احنیف بن قیسؓ کی خدمت میں بھجوا دیے۔

۱۷۔ چھوٹے بچوں پر شفقت کا ہاتھ پھیریئے۔ بچوں کو گود میں لیجیے، پیار کیجیے اور ان کے ساتھ خوش طبعی کا سلوک کیجیے۔ ہر وقت تند خو اور سخت گیر حاکم نہ بنے رہیے، اس طرز عمل سے بچوں کے دل میں والدین کے لیے والہانہ جذبۂ محبت بھی پیدا نہیں ہوتا، ان کے اندر خود اعتمادی بھی نہیں پیدا ہوتی اور ان کی فطری نشو و نما پر بھی خوشگوار اثر نہیں پڑتا۔

ایک مرتبہ اقرع بن حابسؓ نبی ﷺ کے پاس آئے۔ حضور ﷺ اس وقت حضرت حسنؓ کو پیار کر رہے تھے اقرع کو دیکھ کر تعجب ہوا اور بولے یا رسول اللہ ﷺ! آپ بھی بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے تو دس بچے ہیں لیکن میں نے تو کبھی کسی ایک کو بھی پیار نہیں کیا............ نبی ﷺ نے اقرع کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا اگر خدا نے تمہارے دل سے رحمت و شفقت کو نکال دیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟

فاروق اعظمؓ کے دور میں حضرت عامرؓ کسی اہم عہدے پر تھے، ایک بار حضرت عمرؓ سے ملنے کے لیے ان کے گھر پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ لیٹے ہوئے ہیں اور بچے سینے پر چڑھے ہوئے کھیل رہے ہیں.......................... حضرت عامر کو یہ بات کچھ گراں گزری۔ امیر المومنین نے پیشانی کے اتار چڑھاؤ سے ان کی ناگواری کو بھانپ لیا اور حضرت عامرؓ سے بولے: کہیے! آپ کا اپنے بچوں کے ساتھ کیسا برتاؤ رہتا ہے؟

عامرؓ کو موقع مل گیا، بولے امیر المومنین! جب میں گھر میں داخل ہوتا ہوں تو گھر والوں پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ دم سادھ کر چپ ہو جاتے ہیں، حضرت عمرؓ نے بڑے سوز کے ساتھ کہا۔

"عامرؓ! آپ امت محمدیہ ﷺ کے فرزند ہو کر یہ نہیں جانتے کہ مسلمان کو اپنے گھر والوں کے ساتھ کس طرح نرمی اور محبت کا سلوک کرنا چاہیے۔"

۱۸۔اولاد کو پاکیزہ تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے کے لیے اپنی کوشش وقف کر دیجیے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کیجیے۔ یہ آپ کی دینی ذمہ داری بھی ہے، اولاد کے ساتھ عظیم احسان بھی اور اپنی ذات کے ساتھ سب سے بڑی بھلائی بھی۔ قرآن میں ہے:

یا یہا الذین امنوا قوا انفسکم و اھلیکم ناراً۔

"مومنو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے۔"

اور جہنم کی آگ سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ آدمی دین کے ضروری علم سے بہرہ مند ہو اور اس کی زندگی خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری میں گزر رہی ہو۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "باپ اپنی اولاد کو جو کچھ دے سکتا ہے اس میں سب سے بہتر عطیہ اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت ہے۔" (مشکوٰۃ)

اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر تین قسم کے اعمال ایسے ہیں کہ ان کا اجر و ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ صدقہ جاریہ کر جائے، دوسرے یہ کہ وہ ایسا علم چھوڑ جائے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، تیسرے صالح اولاد جو باپ کے لیے دعا کرتی رہے۔" (مسلم)

دراصل اولاد ہی آپ کی تہذیبی روایات، دینی تعلیمات اور پیغام توحید کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہے اور مومن نیک اولاد کی آرزوئیں اسی لیے کرتا ہے تاکہ وہ اس کے بعد اس کے پیغام کو زندہ رکھ سکے۔

۱۹۔بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز سکھائیے، نماز پڑھنے کی تلقین کیجیے اور اپنے ساتھ مسجد لے جا کر شوق پیدا کیجیے اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں اور نماز میں کوتاہی کریں تو انہیں مناسب سزا بھی دیجیے قول و عمل سے ان پر واضح کر دیجیے کہ نماز کی کوتاہی کو آپ برداشت نہ کریں گے۔

۲۰۔بچے جب دس سال کے ہو جائیں تو ان کے بستر الگ کر دیجیے اور ہر ایک کو الگ الگ چارپائی پر سلایئے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"اپنی اولاد کو نماز پڑھنے کی تلقین کرو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور نماز کے لیے ان کو سزا دو جب وہ دس سال کے ہو جائیں، اور اس عمر کو پہنچنے کے بعد ان کے بستر الگ کر دو۔"

۲۱۔بچوں کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھیے۔ ان کی طہارت، نظافت اور غسل وغیرہ کا خیال رکھیے، کپڑے بھی پاک صاف رکھیے، البتہ زیادہ بناؤ سنگھار اور نمود و نمائش سے پرہیز کیجیے۔ لڑکی کے کپڑے بھی نہایت سادہ رکھیے اور زرق برق لباس پہنا کر بچوں کے مزاج خراب نہ کیجیے۔

۲۲۔ دوسروں کے سامنے بچوں کے عیب نہ بیان کیجیے اور کسی کے سامنے ان کو شرمندہ کرنے اور ان کی عزت نفس کو ٹھیس لگانے سے بھی سختی کے ساتھ پرہیز کیجیے۔

۲۳۔ بچوں کے سامنے کبھی بچوں کی اصلاح سے مایوسی کا اظہار نہ کیجیے، بلکہ ان کی ہمت بڑھانے کے لیے ان کی معمولی اچھائیوں کی بھی دل کھول کر تعریف کیجیے۔ ہمیشہ ان کا دل بڑھانے اور ان میں خود اعتمادی اور حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کیجیے تاکہ یہ کارگاہ حیات میں اونچے سے اونچا مقام حاصل کر سکیں۔

۲۴۔ بچوں کو نبیوں کے قصے، صالحین کی کہانیاں اور صحابہ کرامؓ کے مجاہدانہ کارنامے ضرور سناتے رہیں۔ تربیت و تہذیب، کردار سازی اور دین سے شغف کے لیے اس کو انتہائی ضروری سمجھیے۔ اور ہزار مصروفیتوں کے باوجود اس کے لیے وقت نکالیے اکثر و بیشتر ان کو قرآن پاک بھی خوش الحانی کے ساتھ پڑھ کر سنایئے اور موقع موقع سے نبی ﷺ کی پر اثر باتیں بھی بتایئے اور ابتدائی عمر ہی سے ان کے دلوں میں عشق رسول ﷺ کی تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کیجیے۔

۲۵۔ کبھی کبھی بچوں کے ہاتھ سے غریبوں کو کچھ کھانا یا پیسے وغیرہ بھی دلوایئے تاکہ ان میں غریبوں کے ساتھ سلوک اور سخاوت و خیرات کا جذبہ پیدا ہو اور کبھی کبھی یہ موقع بھی فراہم کیجیے کہ کھانے پینے کی چیزیں بہن بھائیوں میں خود ہی تقسیم کریں، تاکہ ایک دوسرے کے حقوق کا احساس اور انصاف کی عادت پیدا ہو۔

۲۶۔ بچوں کی ہر جا و بے جا ضد پوری نہ کیجیے، بلکہ حکمت کے ساتھ ان کی یہ عادت چھڑانے کی کوشش کیجیے، کبھی کبھی مناسب سختی بھی کیجیے، بے جا لاڈ پیار سے ان کو ضدی اور خود سر نہ بنایئے۔

۲۷۔ کرخت آواز سے بولنے اور گلا پھاڑ کر چیخنے چلانے سے خود بھی پرہیز کیجیے اور ان کو بھی تاکید کیجیے کہ درمیانی آواز میں نرمی کے ساتھ گفتگو کریں اور آپس میں بھی ایک دوسرے پر چیخنے چلانے سے سختی کے ساتھ بچیں۔

۲۸۔ بچوں کو عادت ڈالیے کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کریں، ہر کام میں نوکروں کا سہارا نہ لیں۔ اس سے بچے کاہل سست اور اپاہج بن جاتے ہیں بچوں کو جفاکش، محنتی اور سخت کوش بنایئے۔

۲۹۔ بچوں میں باہم لڑائی ہو جائے تو اپنے بچے کی بے جا حمایت نہ کیجیے۔ یہ خیال رکھیے کہ اپنے بچے کے لیے آپ کے سینے میں جو جذبات ہیں وہی جذبات دوسروں کے سینے میں اپنے بچوں کے لیے ہیں، آپ ہمیشہ اپنے بچے کے قصوروں پر نگاہ رکھیے اور ہر پیش آنے والے ناخوشگوار واقعہ میں اپنے بچے کی کوتاہی اور غلطی کی کھوج لگا کر حکمت اور مسلسل توجہ سے اس کو دور کرنے کی پرزور کوشش کیجیے۔

۳۰۔ اولاد کے ساتھ ہمیشہ برابری کا سلوک کیجیے اور اس معاملے میں بے اعتدالی سے بچنے کی پوری پوری کوشش کیجیے۔ اگر طبعاً کسی ایک بچے کی طرف زیادہ میلان ہو تو معذوری ہے، لیکن سلوک و برتاؤ اور لین دین میں ہمیشہ انصاف کا لحاظ رکھیے اور کبھی کبھی کسی ایک کے ساتھ ایسا

امتیازی سلوک نہ کیجیے جس کو دوسرے بچے محسوس کریں۔اس سے دوسرے بچوں میں احساس کمتری، نفرت، مایوسی اور آخر کار بغاوت پیدا ہوگی اور یہ برے جذبات فطری صلاحتیوں کے پروان چڑھنے میں زبردست رکاوٹ اور اخلاق اور روحانی ترقی کے لیے سم قاتل ہیں۔

ایک بار حضرت نعمانؓ کے والد حضرت بشیرؓ اپنے بیٹے کو ساتھ لیے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس ایک غلام تھا، وہ میں نے اپنے اس لڑکے کو بخش دیا۔ نبی ﷺ نے پوچھا کیا تم نے اپنے ہر لڑکے کو ایک ایک غلام بخشا ہے؟ بشیرؓ بولے: نہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس غلام کو تم واپس لے لو اور فرمایا خدا سے ڈرو اور اپنی اولاد کے ساتھ مساوات اور برابری کا سلوک کرو، اب حضرت بشیرؓ گھر واپس آئے اور نعمان سے اپنا دیا ہوا غلام واپس لے لیا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"تو پھر مجھے گناہ پر گواہ نہ بناؤ، میں ظلم کا گواہ نہ بنوں گا۔"

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضور ﷺ نے پوچھا کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ سب لڑکے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ حضرت بشیرؓ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ کیوں نہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "پھر ایسا کام مت کرو۔" (بخاری، مسلم)

۳۱۔ بچوں کے سامنے ہمیشہ اچھا عملی نمونہ پیش کیجیے۔ آپ کی زندگی بچوں کے لیے ایک ہمہ وقتی خاموش معلم ہے جس سے بچے ہر وقت پڑھتے اور سیکھتے رہتے ہیں بچوں کے سامنے کبھی مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولیے۔

حضرت عبداللہ بن عامرؓ اپنا ایک قصہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضور ﷺ ہمارے گھر تشریف رکھتے تھے۔ میری والدہ نے مجھے بلایا اور کہا: "یہاں آ! میں تجھے چیز دوں گی۔ حضور ﷺ نے دیکھ لیا پوچھا: "تم بچے کو کیا دینا چاہتی ہو؟ والدہ بولیں: "مین اس کو کھجور دینا چاہتی ہوں۔" آپ ﷺ نے والدہ سے فرمایا: "اگر تم دینے کا بہانہ کرکے بلاتیں اور بچے کے آنے پر کچھ نہ دیتیں تو تمہارے اعمال نامہ میں جھوٹ لکھ دیا جاتا۔" (ابوداؤد)

۳۲۔ لڑکی کی پیدائش پر بھی اسی طرح خوشی منایئے جس طرح لڑکے کی پیدائش پر مناتے ہیں، لڑکی ہو یا لڑکا دونوں ہی خدا کا عطیہ ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ کے حق میں لڑکی اچھی ہے یا لڑکا۔ لڑکی کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھانا اور دل شکستہ ہونا اطاعت شعار مومن کے لیے کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ یہ ناشکری بھی ہے اور خدائے علیم و کریم کی توہین بھی۔

حدیث میں ہے کہ "جب کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو خدا اس کے ہاں فرشتے بھیجتا ہے جو آکر کہتے ہیں، اے گھر والو! تم پر سلامتی ہو، وہ لڑکی کو اپنے پروں کے سائے میں لے لیتے ہیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ہیں: "یہ کمزور جان ہے جو کمزور جان سے پیدا ہوئی ہے جو اس بچی کی نگرانی اور پرورش کرے گا قیامت تک خدا کی مدد اس کے شامل حال رہے گی۔" (طبرانی)

۳۳۔ لڑکیوں کی تربیت و پرورش انتہائی خوش دلی، روحانی مسرت اور دینی احساس کے ساتھ کیجیے اور اس کے صلے میں خدا سے بہشت بریں کی آرزو کیجیے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "جس شخص نے تین لڑکیوں یا تین بہنوں کی سرپرستی کی انہیں تعلیم و تہذیب سکھائی اور ان کے ساتھ رحم کا سلوک کیا۔ یہں تک کہ خدا ان کو بے نیاز کردے تو ایسے شخص کے لیے خدا نے جنت واجب فرمادی اس پر ایک آدمی بولا، اگر عو

ہی ہوں تو نبی ﷺ نے فرمایا۔ دو لڑکیوں کی پرورش کا بھی یہی صلہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ ایک کے بارے میں پوچھتے تو آپ ﷺ ایک کی پرورش پر بھی یہی بشارت دیتے۔" (مشکوٰۃ)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک دن ایک عورت اپنی دو بچیوں کے لیے میرے پاس آئی اور اس نے کچھ مانگا۔ میرے پاس صرف ایک ہی کھجور تھی، وہ میں نے اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور آدھی آدھی دونوں بچیوں میں بانٹ دی اور خود نہ کھائی اس کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔ اسی وقت نبی ﷺ گھر تشریف لائے میں نے آپ ﷺ کو یہ سارا ماجرا کہہ سنایا، آپ ﷺ نے سن کر فرمایا: "جو شخص بھی بچیوں کی پرورش کے ذریعے آزمایا جائے اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کر کے آزمائش میں کامیاب ہو تو یہ لڑکیاں اس کے لیے قیامت کے روز جہنم کی آگ سے ڈھال بن جائیں گی۔" (مشکوٰۃ)

۳۴۔ لڑکی کو حقیر نہ جانیے، نہ لڑکے کو اس پر کسی معاملے میں ترجیح دیجیے دونوں کے ساتھ یکساں محبت کا اظہار کیجیے اور یکساں سلوک کیجیے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "جس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اس نے جاہلیت کے طریقے پر اسے زندہ دفن نہیں کیا اور نہ اس کو حقیر جانا اور نہ لڑکے کو اس کے مقابلے میں ترجیح دی اور زیادہ سمجھا تو ایسے آدمی کو خدا جنت میں داخل کرے گا۔" (ابوداؤد)

۳۵۔ جائیداد میں لڑکی کا مقررہ حصہ پوری خوش دلی اور اہتمام کے ساتھ دیجیے۔ یہ خدا کا فرض کردہ حصہ ہے اس میں کمی پیشی کرنے کا کسی کو کوئی اختیار نہیں، لڑکی کا حصہ دینے میں حیلے کرنا یا اپنی صواب دید کے مطابق کچھ دے دلا کر مطمئن ہو جانا اطاعت شعار مومن کا کام نہیں ہے۔ ایسا کرنا خیانت بھی ہے اور خدا کے دین کی توہین بھی۔

۳۶۔ ان تمام عملی تدبیروں کے ساتھ ساتھ نہایت سوز اور دل کی لگن کے ساتھ اولاد کے حق میں دعا بھی کرتے رہیے۔ خدائے رحمٰن و رحیم سے توقع ہے کہ وہ والدین کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی پرسوز دعائیں ضائع نہ فرمائے گا۔

## دوستی کے آداب

۱۔ دوستوں سے محبت کیجیے اور دوستوں کے لیے مرکز محبت بنیے۔ وہ شخص انتہائی خوش نصیب ہے جس کو اس کے دوست احباب عزیز رکھتے ہوں اور وہ دوست احباب کو عزیز رکھتا ہو اور وہ شخص انتہائی محروم ہے جس سے لوگ بیزار رہتے ہوں اور وہ لوگوں سے دور بھاگتا ہو۔ مفلس وہ نہیں ہے جس کے پاس دولت نہ ہو بلکہ حقیقت میں سب سے مفلس وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو، دوست زندگی کی زینت، سفر حیات کا سہارا، اور خدا کا انعام ہے۔ دوست بنائیے اور دوست بنیے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"مومن سراپا الفت و محبت ہے اور اس آدمی میں سرے سے کوئی خیر نہیں ہے جو نہ تو دوسروں سے محبت کرے اور نہ دوسرے ہی اس سے محبت کریں۔ (مشکوٰۃ باب الشفقۃ)

قرآن پاک میں ہے:

والمومنون و المومنات بعضهم اولیاء بعض (التوبہ)

"مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں۔"

نبی ﷺ اپنے ساتھیوں سے انتہائی محبت فرماتے تھے اور ہر ایک یہ محسوس کرتا کہ نبی ﷺ سب سے زیادہ اسی کو چاہتے ہیں۔

حضرت عمروؓ بن العاص کہتے ہیں کہ نبی ﷺ اس توجہ اور خلوص کے ساتھ مجھ سے گفتگو فرماتے اور اتنا خیال رکھتے کہ مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ شاید میں اپنی قوم کا سب سے بہتر آدمی ہوں اور ایک دن نبی ﷺ سے پوچھ بیٹھا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں افضل ہوں یا ابو بکرؓ؟ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ابو بکر افضل ہیں۔" پھر میں نے پوچھا: "میں افضل ہوں یا عمرؓ؟ فرمایا: "عمرؓ۔" میں نے پھر پوچھا یارسول اللہ ﷺ میں افضل ہوں یا عثمانؓ؟ ارشاد فرمایا: "عثمان۔" پھر میں نے نبی ﷺ سے بڑی وضاحت کے ساتھ حقیقت معلوم کی اور آپ ﷺ نے بلارو ورعایت صاف صاف بات کہہ دی تب تو مجھے اپنی اس حرکت پر بڑی ہی شرم آئی اور میں دل میں خیال کرنے لگا کہ بھلا ایسی بات پوچھنے کی مجھے کیا ضرورت تھی۔

۲۔ دوستوں کے ساتھ مل جل کر میل محبت کی زندگی گزاریئے اور مخلصانہ تعلقات قائم کرنے اور قائم رکھنے کی کوشش کیجیے۔ دوستوں سے نفرت، بیزاری اور لیے دیے رہنے کی روش چھوڑیئے۔ جب آدمی دوستوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ہر معاملہ میں ان کا شریک رہتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچتی ہیں، کبھی اس کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے، کبھی اس کے وقار کو صدمہ پہنچتا ہے، کبھی اس کے آرام میں خلل پڑتا ہے، کبھی اس کے معمولات متاثر ہوتے ہیں، کبھی اس کی خواہش اور رجحان کے خلاف کچھ باتیں سامنے آتی ہیں، کبھی اس کے صبر و برداشت کی آزمائش ہوتی ہے، کبھی اس کو مالی نقصان پہنچتا ہے۔ غرض مختلف قسم کی اذیتیں اور تکلیفیں اس کو پہنچتی ہیں لیکن جب یہ شخص ان ازیتوں کو برداشت کرتا ہے تو اس کے قلب میں اس سے جلا پیدا ہوتا ہے اچھے اخلاق نشوونما پاتے ہیں اور وہ تربیت و تزکیے کے فطری منازل سے گزرتا ہوا روحانی اور اخلاقی ترقی کرتا ہے اس میں تحمل و بردباری، ایثار و شفقت، ہمدردی و غمگساری، مروت ووفاداری، خیر خواہی و تعاون، خلوص و محبت، سخاوت و شجاعت، اور مرحمت و مواساۃ کے اعلیٰ ترین جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ انسانی معاشرے کے لیے سراپا خیر و برکت بن جاتا ہے۔ ہر دل میں اس کے لیے قدر و عظمت کے جذبات ہوتے ہیں اور ہر انسان اس کے وجود کو اپنے حق میں رحمت کا سایہ و مجھتا ہے، نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"جو مسلمان لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے وہ کہیں بہتر ہے اس شخص سے جو لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہے، اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں پر برداشتہ خاطر ہوتا ہے۔" (ترمذی)

۳۔ ہمیشہ نیک وصالح لوگوں سے دوستی کیجیے، دوستی کے انتخاب میں اس بات کا ضرور لحاظ رکھیے کہ جن لوگوں سے آپ قلبی تعلق بڑھا رہے ہیں وہ دین واخلاق کے پہلو سے آپ کے لیے کس حد تک مفید ہو سکتے ہیں۔ ایک مشہور مثل ہے کہ "اگر کسی کی اخلاقی حالت معلوم کرنا چاہو تو اس کے دوستوں کی اخلاقی حالت معلوم کرو۔" اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لیے ہر آدمی کو غور کر لینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔" (مسند احمد، مشکوۃ)

دوسرکے دین پر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ دوست کی صحبت میں بیٹھے گا تو وہی جذبات وخیالات اور وہی ذوق ورجحان اس میں بھی پیدا ہوگا جو دوست میں ہے اور پسند وناپسند کا وہی معیار اس کا بھی بنے گا جو اس کے دوست کا ہے اس لیے آدمی کو دوست کے انتخاب میں انتہائی غور وفکر سے کام لینا چاہیے اور قلبی لگاؤ اسی سے بڑھانا چاہیے جس کا ذوق ورجحان، افکار وخیالات اور دوڑ دھوپ دین وایمان کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ نبی ﷺ نے تاکید فرمائی کہ مومن ہی سے رشتۂ محبت استوار کرو اور اسی کے ساتھ اپنا کھانا پینا رکھو، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"مومن ہی کی صحبت میں رہو اور تمہارے دستر خوان پر پرہیزگار ہی کھانا کھائے۔"

ایک دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا پینا قلبی تعلق اور محبت کا فطری محرک ہے اور یہ تعلق ومحبت اسی مومن سے ہونا چاہیے جو متقی اور پرہیز گار ہو۔ خدا سے غافل، غیر ذمہ دار، بے عمل، اور بداخلاق لوگوں سے ہمیشہ دور رہیے۔ نبی ﷺ نے اچھے اور برے دوست سے تعلق کی کیفیت کو ایک بلیغ تمثیل میں یوں بیان فرمایا ہے:

"اچھے اور برے دوست کی مثال مشک بیچنے والے اور بھٹی دھونکنے والے لوہار کی طرح ہے۔ مشک بیچنے والے کی صحبت سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا یا مشک خریدو گے یا مشک کی خوشبو پاؤ گے۔ لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑے جلائے گی یا تمہارے دماغ میں اس کی بدبو پہنچے گی۔" (بخاری، مسلم)

اور ابوداؤد میں حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

"نیک دوست کی مثال ایسی ہے جیسے مشک بیچنے والے کی دکان کہ اگر کچھ فائدہ نہ بھی ہو تو خوشبو تو ضرور آئے گی اور برا دوست ایسا ہے جیسے بھٹی سے آگ نہ لگے تب بھی دھوئیں سے کپڑے تو ضرور کالے ہوں گے۔"

۴۔ دوستوں سے صرف خدا کے لیے محبت کیجیے، خدا کے محبوب بندے وہی ہیں، جو خدا کے دین کی بنیاد پر باہم جڑے ہیں اور کندھے سے کندھا اور دل سے دل ملا کر اس طرح خدا کے دین کی اقامت اور حفاظت کا فریضہ انجام دیتے ہیں کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار معلوم ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ

"حقیقت میں خدا کے محبوب وہ لوگ ہیں جو خدا کی راہ میں اس طرح پیر جما کر لڑتے ہیں گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔"

اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"قیامت میں خدا فرمائے گا، وہ لوگ کہاں ہیں جو صرف میرے لیے لوگوں سے محبت کیا کرتے تھے۔ آج میں ان کو اپنے سایے میں جگہ دوں گا۔" (مسلم)

اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو جو قابل رشک شان و شوکت حاصل ہو گی اس کا ذکر کرتے ہوئے نبی ﷺ نے فرمایا:

"خدا کے بندوں میں کچھ (ایسے سعادت مند) ہیں جو نبی اور شہید تو نہیں ہیں لیکن قیامت کے روز خدا ان کو ایسے مرتبوں پر سرفراز فرمائے گا کہ انبیاء اور شہید بھی ان کے رتبوں پر رشک کریں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا: یہ کون خوش نصیب ہوں گے یا رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا: "یہ وہ لوگ ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے محض خدا کے دین کی بنیاد پر محبت کرتے تھے۔ نہ آپس میں رشتہ دار تھے اور نہ ان کے درمیان کوئی مالی لین دین کا تعلق تھا۔ خدا کی قسم قیامت کے روز ان کے چہرے ونہ صرف یہ کہ نور سے جگمگا رہے ہوں گے بلکہ یہ سراپا نور ہوں گے اور جب سارے لوگ خوف سے کانپ رہے ہوں گے تو انہیں کوئی خوف نہ ہو گا اور جب سارے لوگ غم میں مبتلا ہوں گے اس وقت انہیں قطعاً کوئی غم نہ ہو گا اور آپ نے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

الاان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

"سنو! اللہ کے چاہنے والوں کے لیے نہ کسی بات کا کوئی خوف ہو گا اور نہ (گزری ہوئی زندگی کے بارے میں) کسی قسم کا غم۔"

حضرت ابوالدرداءؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"قیامت کے روز کچھ لوگ اپنی قبروں سے آئیں گے اور ان کے چہرے نور سے جگمگا رہے ہوں گے، وہ موتیوں کے منبروں پر بٹھائے جائیں گے، لوگ ان کی شان پر رشک کریں گے یہ لوگ نہ نبی ہوں گے، نہ شہید۔ ایک بدو نے سوال کیا: "یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہیں ہمیں ان کی پہچان بتا دیجیے؟ فرمایا: "یہ ہو لوگ ہیں جو آپس میں خدا کی خاطر محبت کرتے ہیں۔" (طبرانی)

۵۔ نیک لوگوں سے محبت کو آخرت کی نجات اور خدا کی خوشنودی کا ذریعہ سمجھیے اور خدا سے دعا کیجیے کہ خدایا! نیک لوگوں کی محبت عطا کر اور نیک لوگوں میں شامل فرما۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ! ایک شخص کسی نیک آدمی سے اس کی نیکی کی بنا پر محبت کرتا ہے مگر خود اس شخص جیسے اچھے اعمال نہیں کرتا، ارشاد فرمایا: "کوئی مضائقہ نہیں! آدمی قیامت کے روز اسی کی معیت میں ہو گا جس سے وہ محبت کرے گا۔" (بخاری)

ایک شب نبی ﷺ کو خدا کا دیدار ہوا، خدا نے نبی ﷺ سے کہا مانگیے تو نبی ﷺ نے یہ دعا مانگی:

اللھم انی اسئلك فعل الخیرات و ترك المنکرات وحب المساکین و ان تغفرلی و ترحمنی و اذا اردت فتنۃ فی قوم فتوفنی غیر مفتون و اسئلك حبك و حب من یحبك وحب عمل یقربنی الی حبك (مسند احمد)

"خدایا! میں تجھ سے نیک کاموں کی توفیق چاہتاہوں اور برے کاموں سے بچنے کی قوت چاہتاہوں اور مسکینوں کی محبت چاہتاہوں اور یہ کہ تو میری مغفرت فرمادے اور مجھ پر رحم فرمائے اور جب تو کسی قوم کو عذاب میں مبتلا کرنا چاہیے تو مجھے اس حال میں اٹھا کہ میں اس سے محفوظ رہوں اور مین تجھ سے تیری محبت کا سوال کرتاہوں اور اس شخص کی محبت کا سوال کرتاہوں جو تجھ سے محبت کرتا ہے اور اس عمل کی توفیق چاہتاہوں جو تیرے قرب کا ذریعہ ہو۔"

اور حضرت معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

"خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مجھ پر واجب ہے کہ میں ان لوگوں سے محبت کروں جو لوگ میری خاطر آپس میں محبت اور دوستی کرتے ہیں اور میرا ذکر کرنے کے لیے ایک جگہ جمع ہوتے ہو کر بیٹھتے ہیں اور میرے محبت کے سبب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور میری خوشنودی چاہنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں۔" (احمد، ترمذی)

نبی ﷺ دو دوستوں کی ملاقات کا ایمان افروز نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ایک شخص اپنے دوست سے جو کسی دوسری بستی میں رہتا تھا ملاقات کے لیے چلا۔ خدا نے اس کے راستہ میں فرشتے کو بٹھادیا، فرشتے نے اس سے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے جواب دیا، اس گاؤں میں اپنے بھائی سے ملاقات کے لیے جارہاہوں۔ فرشتے نے کہا، کیا تمہارا اس پر کوئی حق نعمت ہے جو وصول کرنے جارہے ہو؟ اس نے کہا نہیں بس اس غرض سے اس کے پاس جارہاہوں کہ میں اس سے خدا کی خاطر محبت کرتاہوں۔ فرشتہ بولا لو سنو! مجھے خدا نے تمہارے پاس بھیجا ہے اور یہ بشارت دی ہے کہ وہ بھی تجھ سے ایسی ہی محبت رکھتا ہے جیسی تو اس کی خاطر اپنے دوست سے رکھتا ہے۔" (مسلم)

۶۔ دوستی ایسے لوگوں سے کیجیے جو اسلامی نقطۂ نظر سے دوستی کے لائق ہوں اور پھر عمر بھر اس دوستی کو نبانے کی کوشش کیجیے، جس طرح یہ ضروری ہے کہ دوستی کے لیے اچھے لوگوں کا انتخاب کیا جائے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ دوستی کو ہمیشہ ہمیشہ بناہنے اور قائم رکھنے کی بھی کوشش کی جائے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز جب عرش الٰہی کے سوا کہیں کوئی سایہ نہ ہوگا۔ اس روز سات قسم کے افراد عرش الٰہی کے سائے میں ہوں گے، ان میں ایک قسم کے افراد وہ دو آدمی ہوں گے جو محض خدا کے لیے ایک دوسرے کے دوست ہوں گے، خدا کی محبت ہی نے ان کو باہم جوڑا ہوگا اور اسی بنیاد پر وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہوں گے یعنی ان کی دوستی خدا کی خاطر ہوگی اور زندگی بھر وہ اس دوستی کو قائم رکھنے اور نباہنے کی کوشش کریں گے اور جب ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے جدا ہو کر دنیا سے رخصت ہورہا ہوگا تو اسی حال میں کہ ان کی یہ دوستی قائم ہوگی اور اسی دوستی کی حالت میں وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں گے۔

۷۔ دوستوں پر اعتماد کیجیے، ان کے درمیان ہشاش بشاش رہیے، افسردہ رہنے اور دوستوں کو افسردہ کرنے سے پرہیز کیجیے، دوستوں کی صحبت میں بے تکلف اور خوش مزاج رہیے، تیوری چڑھانے اور لیے دیے رہنے سے پرہیز کیجیے۔ دوستوں کے ساتھ ایک بے تکلف ساتھ، خوش مزاج ہم نشین اور خوش طبع رفیق بننے کی کوشش کیجیے۔ آپ کی صحبت سے احباب اکتائیں نہیں بلکہ مسرت، زندگی اور کشش محسوس کریں۔

حضرت عبداللہ بن حارثؓ فرماتے ہیں: "میں نے نبی ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔" (ترمذی)

حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی صحبت میں سو مجلسوں سے بھی زیادہ بیٹھا ہوں، ان مجلسوں میں صحابہ کرامؓ اشعار بھی پڑھتے تھے اور زمانہ جاہلیت کے قصے کہانیاں بھی سناتے تھے نبی ﷺ خاموشی سے یہ سب سنتے رہتے تھے بلکہ کبھی کبھی خود بھی ان کے ساتھ ہنسنے میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ (ترمذی)

حضرت شریدؓ کہتے ہیں کہ میں ایک بار نبی ﷺ کے ساتھ سواری پر آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا...... واری پر بیٹھے بیٹھے میں نے نبی ﷺ کو امید بن صلت کے سو شعر سنائے، ہر شعر پر آپ ﷺ فرماتے کچھ اور سناؤ اور میں سناتا۔ (ترمذی)

اسی طرح نبی ﷺ اپنی مجلس میں خود بھی کبھی کبھی قصے سناتے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک بار آپ ﷺ نے گھر والوں کو ایک قصہ سنایا، ایک عورت نے کہا یہ عجیب و غریب قصہ تو بلکل خرافہ کے قصوں کی طرح ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا، تمہیں خرافہ کا صحیح قصہ بھی معلوم ہے اور پھر خود ہی آپ ﷺ نے خرافہ کا اصل قصہ تفصیل سے سنایا۔ اسی طرح ایک بار حضرت عائشہؓ کو گیارہ عورتوں کی ایک بہت ہی دلچسپ کہانی سنائی۔

حضرت بکر بن عبداللہؓ صحابہ کرامؓ کی بے تکلفی اور خوش طبعی کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "صحابہ کرام ہنسی اور تفریح کے طور پر ایک دوسرے کی طرف تربوز کے چھلکے پھینکا کرتے تھے، لیکن جب لڑنے اور مدافعت کرنے کا وقت آتا تو اس میدان کے شہسوار بھی صحابہؓ ہی ہوتے تھے۔" (الادب المفرد)

حضرت محمد بن زیادؒ فرماتے ہیں: "میں نے سلف صالحین کو دیکھا ہے کہ ان کے کئی کئی کنبے ایک ہی حویلی میں رہتے بستے تھے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ ان میں سے کسی ایک کے یہاں مہمان آتا اور کسی دوسرے کے چولہے پر ہانڈی چڑھی ہوتی تو مہمان والا دوست اپنے مہمان کے لیے اپنے دوست کی ہانڈی اتار لے جاتا، بعد میں ہانڈی والا اپنی ہانڈی ڈھونڈتا پھرتا اور لوگوں سے پوچھتا میری ہانڈی کون لے گیا؟ یہ میزبان دوست بتاتا کہ بھائی اپنے مہمان کے لیے ہم لے گئے تھے۔ اس وقت ہانڈی والا کہتا، خدا تمہارے لیے اس میں برکت دے اور محمد بن زیاد فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جب روٹی پکاتے تب بھی یہی صورت حال پیش آتی۔" (الادب المفرد)

حضرت علیؓ کا قول ہے: "دل کو آزاد بھی چھوڑ دیا کرو، خوش کن نکتے بھی سوچا کرو، کیونکہ جسم کی طرح دل بھی تھک جاتا ہے۔"

۸۔ خشک مزاج اور مردہ دل نہ بنیے، خوش طبع اور ہشاش بشاش رہیے، لیکن اس بات کی احتیاط ضرور کیجیے کہ آپ کی خوش طبعی اور ظرافت حد سے بڑھنے نہ پائے خوش مزاجی اور تفریح کے ساتھ ساتھ، دینی وقار، حمیت و غیرت اور توازن و اعتدال کا بھی لحاظ رکھیے۔

نبی ﷺ کے صحابی حضرت عبدالرحمٰنؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کے صحابینہؓ خشک مزاج تھے اور نہ مردوں کی سی چال چلتے تھے، وہ اپنی مجلسوں میں شعر و شاعری بھی کرتے تھے اور دور جاہلیت کے قصے کہانیاں بھی بیان کرتے تھے، لیکن جب ان سے کسی معاملے میں حق کے

خلاف کسی بات کا مطالبہ ہوتا تو ان کی آنکھوں کی پتلیاں غصے میں اس طرح پھر جاتیں کہ جیسے ان پر جنون کی کیفیت طاری ہے۔(الادب المفرد)

مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہؒ سے کسی نے کہا کہ مذاق بھی ایک آفت ہے، انہوں نے جواب دیا نہیں بلکہ سنت ہے مگر اس شخص کے لیے جو اس کے مواقع جانتا ہو اور اچھا مذاق کر سکتا ہو۔(شرح شمائل ترمذی)

۹۔آپ جس شخص سے محبت رکھتے ہوں اس سے اپنی محبت کا اظہار ضرور کیجیے۔اس کا نفسیاتی اثر یہ ہوگا کہ اس کو بھی قرب کا احساس ہوگا اور دونوں طرف کے جذبات واحساسات کے تبادلے سے محبت وخلوص میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور پھر محبت محض ایک قلبی کیفیت نہیں رہے گی، بلکہ اس کے تقاضے عملی زندگی پر اثر انداز ہوں گے اور اس طرح شخصی معاملات میں دلچسپی لینے اور زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے قریب ہرنے کا موقع ملے گا۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "جب کسی شخص کے دل میں اپنے بھائی کے لیے خلوص ومحبت کے جذبات ہوں تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے دوست کو بھی ان جذبات سے آگاہ کر دے اور اسے بتادے کہ وہ اس سے محبت رکھتا ہے۔"(ابوداؤد)

ایک بار آپ ﷺ کے سامنے سے ایک شخص گزرا، کچھ لوگ آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک نے کہا: "یارسول اللہ ﷺ مجھے اس شخص کے ساتھ محض خدا کی خاطر محبت ہے۔یہ سن کر نبی ﷺ نے پوچھا تو کیا تم نے اس شخص کو یہ بات بتادی ہے؟ وہ شخص بولا نہیں تو نبی ﷺ نے فرمایا جاؤ اور اس پر ظاہر کرو کہ تم خدا کے لیے اس سے محبت کرتے ہو، وہ شخص فوراً اٹھا اور جا کر اس جانے والے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا تجھ سے وہ ذات محبت کرے جس کی خاطر تو مجھ سے محبت کرتا ہے۔"(ترمذی،ابوداؤد)

دوستانہ تعلقات کو زیادہ سے زیادہ استوار اور نتیجہ خیز بنانے اور دوستوں سے قریب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ دوستوں کے شخصی اور ذاتی معاملات میں معروف حد تک دلچسپی لیں اور ان سے اپنے قرب اور خصوصی تعلق کا اظہار کریں۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"جب ایک آدمی دوسرے سے دوستی اور اخوت کا رشتہ جوڑے تو اس سے اس کا نام، اس کے باپ کا نام اور اس کے خاندان کے حالات معلوم کرلے کہ اس سے باہمی محبت کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔"(ترمذی)

۱۰۔محبت کے اظہار اور تعلقات کی نوعیت میں ہمیشہ میانہ روی اختیار کیجیے نہ تو ایسی سرد مہری کا مظاہرہ کیجیے کہ آپ کی محبت اور تعلق مشکوک نظر آئے اور نہ ہی جوش محبت میں اتنا آگے بڑھیے کہ آپ کی محبت اور دوستی جنون کی شکل اختیار کرلے اور خدانخواستہ کسی وقت آپ کو پچھتانا پڑے توازن اور اعتدال کا ہمیشہ لحاظ رکھیے اور مستقل مزاجی کے ساتھ ایسی متوازن روش اختیار کیجیے جس کو آپ برابر نباہ سکیں۔ حضرت اسلمؓ کا بیان ہے:

"حضرت عمرؓ نے فرمایا تمہاری محبت جنون کی شکل نہ اختیار کرنے پائے اور تمہاری دشمنی ایذار سانی کا باعث نہ بننے پائے۔ میں نے کہا حضرت وہ کیسے ؟آپ نے فرمایا(وہ ایسے کہ )جب محبت کرنے لگو تو بچوں کی طرح چمٹنے اور طفلانہ حرکتیں کرنے لگو اور جب کیس سے ناراض ہو تو اس کے جان و مال تک کی تباہی اور بربادی کے درپے ہو جاؤ۔"(الادب المفرد)

حضرت عبید کندیؒ فرماتے ہیں: "میں نے حضرت علیؓ سے سنا۔ فرمارہے تھے: "اپنے دوست سے دوستی میں فرمی اور میانہ روی اختیار کرو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت تمہارا دشمن بن جائے اسی طرح دشمن سے دشمنی میں نرمی اور اعتدال کا رویہ اختیار کرو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت تمہارا دوست بن جائے۔"(الاداب المفرد)

۱۱۔ دوستوں کے ساتھ وفاداری اور خیر خواہی کا سلوک کیجیے۔ دوست کے ساتھ سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ آپ اس کو اخلاقی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ اونچا اٹھانے کی کوشش کریں اور اس کی دنیا بنانے سے زیادہ اس کی آخرت بنانے کی فکر کریں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

"دین کا سرتاپیر خیر خواہی ہے۔"

خیر خواہی کا اصل میعار یہ ہے کہ آپ اپنے دوست کے لیے بھی وہی پسند کریں جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں،اس لیے کہ آدمی اپنا برا کبھی نہیں چاہتا۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"اس ذات کی قسم جو کے قبضے میں میری جان ہے: کوئی بندہ مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ بھائی کے لیے بھی وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔"

اور مسلمان پر مسلمان کے چھ حقوق بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

"اور یہ کہ وہ اپنے بھائی کی خیر خواہی چاہے خواہ وہ غائب ہو یا موجود۔"

اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

"بے شک خانے اس شخص پر آگ کو واجب کر دیا ہے اور جنت حرام کر دی ہے جس نے قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارا، صحابہؓ میں سے کسی نے پوچھا: "اگرچہ وہ کوئی معمولی سی چیز ہو؟آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں اگرچہ وہ پیلو کی معمولی سی شاخ ہی کیوں نہ ہو۔"

۱۲۔ دوستوں کے دکھ درد میں شریک رہیے اور اسی طرح ان کی خوشیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیجیے۔ ان کے غم میں شریک ہو کر غم غلط کرنے کی کوشش کیجیے اور ان کی مسرتوں میں شریک ہو کر مسرتوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کیجیے۔ ہر دوست اپنے مخلصین سے بجا

طور پر توقع رکھتا ہے کہ وہ مصیبت میں اس کا ساتھ دیں گے اور وقت پڑنے پر اس کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔اسی طرح وہ یہ بھی توقع رکھتا ہے کہ اس کے دوست اس کی خوشیوں میں اضافہ کریں اور اس کی اجتماعی تقریبات کی زینت اور رونق بڑھائیں۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔

"ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے کہ ایک دوسرے کو قوت پہنچاتا اور سہارا دیتا ہے جیسے عمارت کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کا سہارا بنتی ہے اور قوت پہنچاتی ہے۔"

اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال دیں (اور اس طرح مسلمانوں کے باہمی تعلق اور قرب کو واضح فرمایا")(بخاری، مسلم)

اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: "تم مسلمانوں کو باہم رحم دلی، باہم الفت و محبت، اور باہم تکلیف کے احساس میں ایسا پوؤ گے جیسے ایک جسم کہ اگر ایک عضو بیمار پڑ جائے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں اس کا شریک رہتا ہے۔"(بخاری، مسلم)

۱۳۔دوستوں سے خوش دلی، نرم خوئی، اور مسرت و اخلاص سے ملیے اور نہایت توجہ اور خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیجیے۔لاپروائی، بے نیازی اور روکھے پن سے پرہیز کیجیے، یہ دلوں کو پھاڑنے والی برائیاں ہیں۔ملاقات کے وقت ہمیشہ مسرت، اطمینان اور شکر و حمد کے کلمات کہیے۔کہ آپ کے دوست، خوشی اور زندگی محسوس کریں ایسے افسردہ چہرے سے ان کا استقبال نہ کیجیے کہ ان کا دل بجھ جائے وہ آپ کی ملاقات کو وبالِ جان سمجھنے لگیں۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:۔

"نیکیوں میں کسی نیکی کو حقیر نہ جانو چاہے وہ اتنی ہی ہو کہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو۔"(مسلم)

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "اپنے بھائی کو دیکھ کر تمہارا مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔"(ترمذی)

نرم خوئی، خوش اخلاقی اور نرمی سے ہی دونوں میں الفت و محبت پیدا ہوتی ہے اور انہی صفات کی بدولت اچھا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

نبی ﷺ فرماتے ہیں:

"میں تمہیں اس آدمی کی پہچان بتاتا ہوں جس پر جہنم کی آگ حرام ہے اور وہ آگ پر حرام ہے یہ وہ آدمی ہے جو نرم مزاج ہو، نرم طبیعت ہو اور نرم خو ہو۔"(ترمذی)

صحابہؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ جب ملاقات کے وقت کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پورے جسم سے متوجہ ہوتے اور جب کوئی آپ ﷺ پوری طرح متوجہ ہو کر اس کی بات سنتے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ایک شخص آیا تو آپ ﷺ نے اپنے جسم کو حرکت دی اور ذرا سمٹے،اس شخص نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! جگہ تو کشادہ ہے،نبی ﷺ نے فرمایا:

"مسلمان کا یہ حق ہے کہ جب اس کا بھائی اسے دیکھے تو وہ اس کے لیے ذرا اپنے جسم کو حرکت دے۔"(بیہقی)

مومنین کی تعریف میں قرآن کا ارشاد ہے:

اذلۃعلی المومنین

"وہ مومنوں کے لیے بڑے نرم خو ہوتے ہیں۔"

اور نبی ﷺ نے اس حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے:

"مومن بردبار اور نرم خو ہوتے ہیں اس اونٹ کی طرح جس کی ناک میں نکیل پڑی ہو،اس کو کھینچا جائے تو وہ کھنچتا چلا آئے اور پتھر پر بٹھایا جائے تو پتھر پر بیٹھ جائے۔"(ترمذی)

۱۴۔اگر کبھی کسی بات پر اختلاف ہو جائے تو فوراً صلح صفائی کر لیجیے اور ہمیشہ معافی طلب کرنے اور اپنے قصور کا اعتراف کرنے میں پیش قدمی کیجیے۔

حضرت ابوالدرداؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ میں کسی معاملے میں سخت کلامی ہو گئی۔بعد میں حضرت ابو بکرؓ کو بہت احساس ہوا اور وہ انتہائی مغموم نبی ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور فرمایا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے اور عمرؓ کے درمیان کچھ اختلاف ہو گیا مجھے غصہ آگیا اور کچھ سخت باتیں ہو گئیں۔مجھے بعد میں بڑی شرمندگی ہوئی اور میں عمرؓ سے معافی چاہی لیکن یا رسول اللہ ﷺ! وہ معاف کرنے کو تیار نہ ہوئے۔میں پریشان ہو کر آپ ﷺ کی خدمت میں آیا۔نبی ﷺ نے فرمایا خدا تمہیں معاف فرمائے گا اور تمہیں بخش دے گا،اسی دوران حضرت عمرؓ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ دوڑے دوڑے حضرت ابو بکرؓ کے گھر پہنچے وہاں معلوم ہوا کہ ابو بکرؓ نبی ﷺ کی خدمت میں گئے ہیں تو وہ بھی اسی وقت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔حضرت عمرؓ کو دیکھ کر نبی ﷺ کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔یہ دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ بہت ڈرے اور نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ گھٹنوں کے بل ہو کر نبی ﷺ سے عرض کیا،"یا رسول اللہ ﷺ! عمرؓ کا کوئی قصور نہیں۔قصور سارا میرا ہی ہے میں نے زیادتی کی ہے اور میں نے ہی انہیں سخت سست کہا ہے۔"

یہ دیکھ کر نبی ﷺ نے فرمایا:

"خدا نے مجھے تمہارے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا اور جب ابتداء میں تم لوگ مجھے جھٹلا رہے تھے اس وقت ابو بکرؓ نے میری تصدیق کی اور جان و مال سے ہر طرح میرا ساتھ دیا تو کیا اب تم میرے ساتھی کو رنجیدہ کر کے چھوڑو گے؟"

صلح صفائی کی کوشش میں کبھی تاخیر نہ کیجیے، جتنی تاخیر ہوتی جاتی ہے اتنی ہی خرابی جڑ پکڑتی جاتی ہے اور دلوں میں دوری پیدا ہوتی جاتی ہے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ نصیحت بڑی ہی ایمان افروز ہے:

"پس اگر تو قربان گاہ پر اپنی نذر گزارتا ہو اور وہاں تجھے عاد آئے کہ بھائی کو مجھ سے شکایت ہے تو وہیں قربان گاہ کے آگے ہی اپنی نذر چھوڑ دے اور جاکر اپنے بھائی سے ملاپ کر تب اپنی نذر گزار۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"لوگوں کے اعمال ہر پیر اور جمعرات کو ہفتہ میں دو روز پیش ہوتے ہیں اور ہر مومن کو بخش دیا جاتا ہے سوائے اس کے جس کے دل میں اپنے مومن بھائی سے کوئی عداوت ہو کہا جاتا ہے ان کو چھوڑ دو تاکہ یہ آپس میں صلح کر لیں۔"

کسے معلوم کہ آئندہ لمحہ زندگی کا ہے یا موت کا اور کون جانتا ہے کہ اسے پیر یا جمعرات کا دن زندگی میں دیکھنا نصیب ہو گا یا نہیں تو پھر قلب کی صفائی اور دوستوں کی شکایت دور کرنے میں تاخیر کیوں اور کس امید پر؟ کیا یوم آخر پر یقین رکھنے والا ہوش منداس کے لیے تیار ہے کہ وہ کھوٹ کھپٹ سے بھرا ہوا تاریک اور گھناؤنا دل لے کر خدا کے حضور پہنچے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس کا بھی خیال رکھیے کہ جب آپ کا دوست اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور معافی چاہے تو اس کا عذر قبول کیجیے اور اس کو معافکر دیجیے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"جس نے کسی مسلمان بھائی سے اپنی غلطی پر عذر کیا اور اس نے اس کو معذور نہ سمجھا اس کے عذر کو قبول نہ کیا اس پر اتنا گناہ ہو گا جتنا ایک ناجائز محصول وصول کرنے والے پر اس ظلم وزیادتی کا گناہ ہوتا ہے۔"

۱۵۔ دوستوں کی جانب سے اگر کوئی بات طبیعت اور ذوق کے خلاف بھی ہو جاۓ تو آپ اپنی زبان پر قابو رکھیے اور جواب مین کبھی سخت کلامی یا بدزبانی نہ کیجیے بلکہ حکمت اور نرمی کے ساتھ بات کو ٹال جایئے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے پوچھا۔ اے میرے رب! آپ کے نزدیک آپ کے بندوں میں کون سب سے پیارا ہے خدا نے جواب دیا وہ جو انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود معاف کر دے گا۔" (مشکوۃ)

اور نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

"مومن کی میزان میں قیامت کے روز جو سب سے زیادہ وزنی چیز رکھی جائے گی وہ اس کا حسن اخلاق ہو گا اور خدا کو وہ شخص بڑا ہی مبغوض ہے جو زبان سے بے حیائی کی بات نکالتا اور بدزبانی کرتا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے حسن اخلاق کی تعریف تین باتوں سے فرمائی ہے۔

(۱)۔جب آدمی کسی سے ملے تو ہنستے چہرے سے ملے۔

(۲)۔خدا کے محتاج اور ضرورت مندوں پر خرچ کرے۔

(۳)۔اور کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خدا کی نظر میں بدترین آدمی قیامت کے روز وہ ہو گا جس کی بدزبانی اور فحش کلامی کی وجہ سے لوگ اسے ملنا چھوڑ دیں۔" (بخاری، مسلم)

۱۶۔اپنے دوستوں کی اصلاح و تربیت سے کبھی غفلت نہ کیجیے اور اپنے دوستوں میں وہ بیماری کبھی نہ پیدا ہونے دیجیے جو اصلاح و تربیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔یعنی خود پسندی اور کبر، دوستوں کو ہمیشہ آمادہ کرتے رہیے کہ وہ اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کو محسوس کریں، اپنی خطاؤں کے اعتراف مین جرأت سے کام لیں اور اس حقیقت کو ہمہ وقت نگاہ میں رکھیں کہ اپنی کوتاہی کو محسوس نہ کرنے اور اپنی جرأت پر اصرار کرنے سے نفس کو بدترین غذا ملتی ہے۔

دراصل نمائشی عاجزی دکھانا، الفاظ میں حقیر کہنا، رفتار اور انداز میں خشوع کا اظہار کرنا۔یہ نہایت آسان ہے لیکن اپنے نفس پر چوٹ سہنا، اپنی کوتاہیوں کو ٹھنڈے دماغ سے سننا اور تسلیم کرنا اور اپنے نفس کے خلاف دوستوں کی تنقید برداشت کرنا انتہائی مشکل کام ہے لیکن حقیقی دوست وہی ہیں جو بیدار ذہن کے ساتھ ایک دوسرے کی زندگی پر نگاہ رکھیں اور اس پہلو سے ایک دوسرے کی تربیت و اصلاح کرتے ہوئے کبر اور خود پسندی سے بچاتے رہیں۔

نبی ﷺ فرماتے ہیں:

"تین باتیں ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں۔

(۱)۔ایسی خواہش کہ انسان اس کا تابع اور غلام بن کر رہ جائے۔

(۲)۔ایسی حرص جس کو پیشوا مان کر آدمی اس کی پیروی کرنے لگے۔

(۳)۔خود پسندی.........اور یہ بیماری ان تینوں میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔" (بیہقی، مشکوٰۃ)

تنقید اور احتساب ایک ایسا نشتر ہے جو اخلاقی وجود کے تمام فاسد مادوں کو باہر نکال پھینکتا ہے اور اخلاقی توانائیوں میں خاطر خواہ اضافہ کر کے فرد اور معاشرے میں نئی زندگی کی روح پھونک دیتا ہے۔ دوستوں کے احتساب اور تنقید پر بپھرنا، ناک بھوں چڑھانا اور خود کو اس سے بے نیاز سمجھنا بھی ہلاکت ہے اور اس خوشگوار فریضے کو ادا کرنے میں کوتاہی برتنا بھی ہلاکت ہے۔ دوستوں کے دامن پر گھناؤنے دھبے نظر آئیں تو بے چینی محسوس کیجیے اور انہیں صاف کرنے کی حکیمانہ تدبیریں کیجیے اور اسی طرح خود بھی فراخ دلی اور عاجزی کے ساتھ دوستوں کو یہ موقع دیجیے کہ وہ آپ کے داغ دھبوں کو آپ پر نمایاں کریں اور جب وہ یہ تلخ فریضہ انجام دیں تو اپنے نفس کو بھلانے کے بجائے انتہائی عالی ظرفی، خوش دلی اور احسان مندی کے جذبات سے ان کی تنقید کا استقبال کیجیے اور ان کے اخلاص و کرم کا شکریہ ادا کیجیے۔ نبی ﷺ نے مثالی دوستی کی اس کیفیت کو ایک بلیغ تمثیل سے اس طرح واضح فرمایا:

"تم میں سے ہر ایک "اپنے بھائی کا آئینہ " ہے پس اگر وہ اپنے بھائی میں کوئی خرابی دیکھے تو اسے دور کر دے۔"(ترمذی)

اس تمثیل میں پانچ ایسے روشن اشارے ملتے ہیں جس کو پیش نظر رکھ کر آپ اپنی دوستی کو واقعی مثالی دوستی بنا سکتے ہیں۔

(۱)۔آئینہ آپ کے داغ دھبے اسی وقت ظاہر کرتا ہے جب آپ اپنے داغ دھبے دیکھنے کے ارادے سے اس کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں اور جب آپ اس کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں تو وہ بھی مکمل خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔

اسی طرح آپ بھی دوست کے عیوب اسی وقت واضح کریں جب وہ خود کو تنقید کے لیے آپ کے سامنے پیش کرے اور فراخ دلی سے تنقید و احتساب کا موقع دے اور آپ بھی محسوس کریں کہ اس وقت اس کا ذہن تنقید سننے کے لیے تیار ہے اور دل میں اصلاح قبول کرنے کے لیے جذبات موجزن ہیں اور اگر آپ یہ کیفیت نہ پائیں تو حکمت کے ساتھ اپنی بات کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھیں اور خاموشی اختیار کریں اور اس کی غیر موجودگی میں تو اس قدر احتیاط کریں کہ آپ کی زبان پر کوئی ایسا لفظ بھی نہ آئے جس سے اس کے کسی عیب کی طرف اشارہ ہوتا ہو اس لیے کہ یہ غیب ہے اور غیب سے دل جڑتے ہیں بلکہ پھٹتے ہیں۔

(۲)۔آئینہ چہرے کے انہی داغ دھبوں کی صحیح صحیح تصویر پیش کرتا ہے جو فی الواقع چہرے پر موجود ہوتے ہیں۔ نہ وہ کم بتاتا ہے اور نہ وہ ان کی تعداد کو بڑھا کر پیش کرتا ہے۔ پھر وہ چہرے کے صرف انہی عیوب کو نمایاں کرتا ہے جو اس کے سامنے آتے ہیں، وہ چھپے ہوئے کا تجسس نہیں کرتا اور نہ کرید کرید کر عیوب کی کوئی خیالی تصویر پیش کرتا ہے۔ اسی طرح آپ بھی اپنے دوست کے عیوب بلا کم و کاست بیان کریں نہ تو بے جا مروت اور خوشامد میں عیوب چھپائیں اور نہ اپنی خطابت اور زورِ بیان سے اس میں اضافہ کریں اور پھر صرف وہی عیوب بیان کریں جو عام زندگی سے آپ کے سامنے آئیں۔ تجسس اور ٹوہ میں نہ لگیں پوشیدہ و عیبوں کو کریدنا کوئی اخلاقی خدمت نہیں بلکہ ایک تباہ کن اور اخلاق سوز عیب ہے۔

نبی ﷺ ایک بار منبر پر چڑھے اور نہایت اونچی آواز میں آپ ﷺ نے حاضر کو تنبیہ فرمائی۔

"مسلمانوں کے عیوب کے پیچھے نہ پڑو جو شخص اپنے مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کے پوشدہ عیوب کے درپے ہوتا ہے تو پھر خدا اس کے پوشیدہ عیوب کو طشت از بام کرنے پر تل جاتا ہے اور جس کے عیب افشا کرنے پر خدا تل جائے تو وہ اس کو رسوا کر کے ہی چھوڑتا ہے اگرچہ وہ اپنے گھر کے اندر گھس کر ہی کیوں نہ بیٹھ جائے۔"(ترمذی)

(۳)۔آئینہ غرض سے پاک ہو کر بے لاگ انداز میں اپنا فرض ادا کرتا ہے اور جو شخص بھی اس کے سامنے اپنا چہرہ پیش کرتا ہے وہ بغیر کسی غرض کے اس کا صحیح صحیح نقشہ اس کے سامنے رکھ دیتا ہے نہ وہ کسی سے بغض اور کینہ رکھتا ہے اور نہ کسی سے انتقام لیتا ہے۔آپ بھی ذاتی اغراض، جذبہ انتقام، بغض و کینہ اور ہر طرح کی بدنیتی سے پاک ہو کت بے لاگ احتساب کیجیے اور اس لیے کیجیے کہ آپ کا دوست اپنے کو سنوار لے جس طرح آئینہ کو دیکھ کر آدمی اپنے کو سنوار لیتا ہے۔

(۴)۔آئینہ میں اپنی صحیح تصویر دیکھ کر نہ تو کوئی جھنجھلاتا ہے اور نہ غصے سے بے قابو ہو کر آئینہ توڑ دینے کی حماقت کرتا ہے، بلکہ فوراًاپنے کو سنوارنے میں لگ جاتا ہے اور دل ہی دل میں آئینے کی قدر و قیمت محسوس کرتے ہوئے زبان حال سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہے اور کہتا ہے واقعی آئینے نے میرے بنانے سنوارنے میں میری بڑی مدد کی اور فطری فریضہ انجام دیا اور پھر نہایت احتیاط کے ساتھ دوسرے وقت کے لیے اس کو بحفاظت رکھ دیتا ہے،اسی طرح آپ کا دوست اپنے الفاظ کے آئینے میں آپ کے سامنے آپ کی صحیح تصویر رکھے تو جھنجھلا کر دوست پر جوابی حملہ نہ کریں، بلکہ اس کے شکر گزار ہوں کہ اس نے دوستی کا حق ادا کیا اور نہ صرف زبان سے بلکہ دل سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس لمحے سے اپنی اصلاح و تربیت کے لیے فکر مند ہو جائیں اور انتہائی فراخ دلی اور احسان مندی کے ساتھ دوست کی قدر و عظمت محسوس کرتے ہوئے اس سے درخواست کریں کہ آئندہ بھی وہ آپ کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتا رہے۔

(۵)۔اور آخری اشارہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ہر ایک "اپنے بھائی کا آئینہ " ہے اور بھائی بھائی کے لیے اخلاص و محبت کا پیکر ہوتا ہے، وفادار اور خیر خواہ ہوتا ہے، ہمدرد اور غمگسار ہوتا ہے، بھائی کو مصیبت میں دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور خوش دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے اس لیے بھائی اور دوست جو تنقید کرے گا اس میں انتہائی دل سوزی اور غم خواری ہو گی، محبت اور خلوص ہو گا، بے پایاں دردمندی اور خیر خواہی ہو گی اور لفظ لفظ جذبہ اصلاح کا آئینہ ہو گا اور ایسی تنقید سے دلوں کو جوڑنے اور زندگیوں کو بنانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

۱۷۔دوستوں سے خلوص و محبت کا اظہار کرنے اور محبت کو اور زیادہ بڑھانے کے لیے ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ بھی کیجیے۔ہدیوں کے لینے دینے سے دل جڑتے ہیں اور محبتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:"ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجا کرو تو آپس محبت پیدا ہو گی اور دلوں کی کدورت جاتی رہے گی۔"(مشکٰوۃ)

نبی ﷺ خود اپنے اصحابؓ کو کثرت سے ہدیے دیتے تھے اور آپ ﷺ کے صحابہؓ بھی آپس میں کثرت سے ایک دوسرے کو ہدیے اور تحفے دیتے رہتے تھے۔

ہدیہ دیتے وقت اپنی حیثیت کو سامنے رکھیے اور یہ نہ سوچیے کہ آپ جس کو ہدیہ دیں قیمتی ہدیہ دیں، جو میسر ہو دیجیے، ہدیہ کے قیمتی ہونے نہ ہونے کا انحصار آپ کے اخلاص اور جذبات پر ہے اور یہی اخلاص و جذبات دلوں کو جوڑتے ہیں۔ ہدیے کی قیمت نہیں جوڑتی، اسی طرح دوست کے ہدیے کو بھی کبھی حقیر نہ سمجھیے اس کے اخلاص و محبت پر نگاہ رکھیے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "اگر مجھے تحفے میں کوئی بکری کا ایک پایا بھی پیش کرے تو میں ضرور قبول کروں گا۔ اگر کوئی دعوت میں ایک پایا ہی کھلائے تو میں ضرور اس کی دعوت میں جاؤں گا۔" (ترمذی)

ہدیے کے بدلے میں ہدیہ ضرور دیجیے۔ نبی ﷺ اس کا اہتمام فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے نزدیک پسندیدہ تحفہ، خشبو کا تحفہ تھا۔ آپ بھی اس تحفے کو پسندیدہ سمجھیے اور آج کے حالات میں کتاب بھی بہترین تحفہ ہے۔

اسی سلسلہ میں کبھی کبھی ساتھ مل کر کھانے پینے کا بھی اہتمام کیجیے۔ دوستوں کو اپنے یہاں کھانے پر بلایئے، دوست احباب دعوت کریں تو نہایت خوشی سے ان کی یہاں جایئے۔ اس سے بھی محبت اور خلوص کے جذبات بڑھتے اور مستحکم ہوتے ہیں البتہ اس طرح کے مواقع پر غیر معمولی تکلفات برتنے اور سامان خورد و نوش میں فراوانی دکھانے کے بجائے آپ اخلاص و محبت کے جذبات کی مقدار بڑھانے پر زیادہ توجہ دیجیے۔

۱۸۔ دوستوں کی خبر گیری کیجیے۔ ضرورتوں میں ان کے کام آیئے اور ہر طرح جان و مال سے ان کی مدد کیجیے۔ اصبہانی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک آدمی آیا اور پوچھا کہ لوگوں میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ آپ نے جواب دیا:

"تمام لوگوں میں خدا کے نزدیک محبوب وہ آدمی ہے جو انسانوں کو زیادہ نفع پہنچانے والا ہو اور اعمال میں خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ یہ ہے کہ تو کسی مسلمان کو خوش کر دے۔ اس طرح کہ اس کی مصیبت و مشکل دور کرے یا اس کی بھوک مٹا دے اور یہ بات کہ میں کسی بھائی کے ساتھ اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے جاؤں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں (نبی ﷺ کی) اس مسجد مین اعتکاف کروں اور جس شخص نے اپنا غصہ اس حال میں پی لیا کہ اگر وہ چاہتا تو اپنے غصہ کو پورا کر لیتا تو قیامت کے روز خدا اس کے دل کو اپنی خوشنودی سے بھر دے گا اور جو اپنے بھائی کے ساتھ اس کی ضرورت پوری کرنے کی خاطر چلا اور اس کی وہ ضرورت پوری کر دی تو خدا اس کے دونوں قدموں کو اس دن ثبات بخشے گا جب قدم لڑکھڑا رہے ہوں گے۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو کسی مسلمان کی کوئی مصیبت دور کرے گا تو خدا قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔" (بخاری، مسلم)

اور آپ ﷺ نے فرمایا: "خدا اپنے بندے کی مدد میں اس وقت تک لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔" (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "کسی مسلمان کی حاجت پوری کرنے کا اجر و ثواب دس سال کے اعتکاف سے بھی زیادہ ہے۔" (طبرانی)

اور حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو آدمی اپنے مسلمان بھائی کے پاس خوشی اور مسرت کی بات لے کر پہنچا ہے اور اس بات سے اس کو خوش کر دیتا ہے تو خدا قیامت کے دن اس بندے کو خوش کر دے گا۔" (طبرانی)

۱۹۔ بہترین رازدار بنیے۔ دوست آپ پر اعتماد کر کے آپ سے دل کی بات کہہ دے تو اس کی حفاظت کیجیے۔ اور کبھی دوست کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگایئے۔ اپنے سینے کو رازوں کا محفوظ دفینہ بنایئے تاکہ دوست بغیر کسی جھجک کے ہر معاملہ میں مشورہ لے سکے۔ اور آپ دوست کو اچھے مشورے دے سکیں اور تعاون کر سکیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ حفصہؓ جب بیوہ ہوئیں تو میں عثمانؓ سے ملا اور کہا کہ اگر تم چاہو تو حفصہ کا نکاح تم سے کر دوں، عثمانؓ نے جواب دیا میں اس معاملے پر غور کروں گا، میں نے کئی راتوں تک ان کا انتظار کیا پھر عثمانؓ مجھ سے ملے اور بولے میرا ابھی شادی کرنے کا خیال نہیں ہے، پھر میں ابو بکر کے پاس گیا اور کہا اگر آپ پسند فرمائیں تو حفصہؓ کو اپنی زوجیت میں لے سکتے ہیں۔ وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا مجھے ان کی خاموشی بہت کھلی، عثمانؓ سے بھی زیادہ کھلی۔ اس طرح کئی دن گزر گئے پھر نبی ﷺ نے حفصہؓ کا پیغام بھیجا اور میں نے نبی ﷺ سے حفصہؓ کا نکاح کر دیا۔ اس کے بعد ابو بکرؓ مجھ سے ملے اور فرمایا: تم نے مجھ سے حفصہؓ کا ذکر کیا تھا اور میں نے خاموشی اختیار کی تھی ہو سکتا ہے تمہیں میری خاموشی سے تکلیف ہوئی ہو۔ میں نے کہا ہاں تکلیف تو ہوئی تھی۔

فرمایا: مجھے معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا خود ایسا خیال ہے اور یہ آپ کا ایک راز تھا جس کو میں ظاہر کرنا نہ چاہتا تھا۔ اگر نبی ﷺ ذکر نہ فرماتے تو میں ضرور قبول کر لیتا۔ (بخاری)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں لڑکوں میں کھیل رہا تھا کہ اتنے میں نبی ﷺ تشریف لائے اور ہمیں سلام کیا پھر اپنی ایک ضرورت بتا کر مجھے بھیجا مجھے اس کام کے کرنے میں دیر لگی۔ کام سے فارغ ہو کر جب میں گھر گیا تو ماں نے پوچھا: اتنی دیر کہاں لگائی! میں نے کہا: نبی ﷺ نے اپنی ایک ضرورت سے بھیجا تھا۔ بولیں کیا ضرورت تھی؟ میں نے کیا وہ راز کی بات ہے۔ ماں نے کہا دیکھو رسول اللہ ﷺ کا راز کسی کو نہ بتانا۔ (مسلم)

۲۰۔ اجتماعی اخلاق میں ایسی وسعت، ہمہ جہتی، تحمل اور سمائی پیدا کیجیے کہ ہر ذوق و طبیعت اور ہر فکر و رجحان رکھنے والا آپ کی ذات میں غیر معمولی کشش محسوس کرے اور آپ ہر ایک کے مخصوص ذوق و رجحان اور مخصوص افتاد طبع کی رعایت کرتے ہوئے ایسا حکیمانہ سلوک کیجیے کہ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ ہر ایک کو اپنے مخصوص ذوق کے پیمانے سے ناپنے کی غیر حکیمانہ کوشش نہ کیجیے اور نہ ہر ایک کو اپنی افتاد طبع پر ڈھالنے کی ناکام اور مہمل کوشش کیجیے، ذوق و طبیعت کا اختلاف ایک فطری حسن ہے فطرت کے حسن کو مصنوعی حسن کی بیجا توقع میں مسخ نہ کیجیے۔ ہر دوست کو اس کے فطری مقام پر رکھتے ہوئے اس سے دلچسپی لیجیے اور اس کی قدر و عظمت کیجیے اور اپنے ہمہ گیر اخلاق کے ذریعہ اس کو اپنی ذات سے وابستہ رکھنے کی کوشش کیجیے۔

نبی ﷺ کی ہمہ جہتی عبقریت ہی کا یہ کمال تھا کہ ہر ذوق اور ہر طبیعت کا انسان آپ کی مجلس میں سکون پاتا اور اپنی افتاد طبع کی حکیمانہ رعایت پاتے ہوئے کوئی ادنی اجنبیت بھی محسوس نہ کرتا۔آپ کی مجلس میں ابو بکرؓ جیسے سراپا حلم وشفقت بھی تھے اور عمر فاروقؓ جیسے برہنہ شمشیر بھی، حسان بن ثابتؓ جیسے جنگ سے لرزنے والے بھی اور علیؓ جیسے فاتح خیبر بھی، ابوذر غفاری جیسے فقیر منش، غم پسند بھی، اور عبدالرحمن بن عوفؓ جیسے صاحب دولت وجمال بھی۔ لیکن نبیو کے وسعت اخلاق، اعلی کردار، اور حسن فکر وتدبیر کا کمال یہ تھا کہ یہ بھی سب نبی ﷺ کی ذات سے بے مثال والہانہ عشق رکھتے اور نبی ﷺ بھی ان کا اس قدر لحاظ رکھتے کہ ہر ایک یہ سمجھتا کہ شاید نبی ﷺ سب سے زیادہ مجھی کو چاہتے ہیں، اور اس وسعت اخلاق، حسن فکر وتدبیر اور غیر معمولی ایثار کی بدولت آپ نے صحابہ کرامؓ کا وہ مثالی جتھہ تیار کیا جن میں طبیعتوں کے باہمی اختلاف کے باوجود وہ بے مثال یکجہتی، غیر معمولی اتحاد وتعاون اور قابل رشک الفت ولگاؤ تھا کہ انسانی تاریخ اپنے ان صفحات کو بجا طور پر اپنی طویل عمر کا حاصل سمجھتی ہے۔

آپ کی دوستیاں درحقیقت اسی وقت کامیاب اور پائیدار ہو سکتی ہیں جب آپ اجتماعی اخلاق میں حکیمانہ لچک اور غیر معمولی صبر وتحمل پیدا کریں اور دوستانہ تعلقات میں رواداری، عفو درگزر، فیاضانہ برتاؤ، جذباتی ایثار، باہمی مراعات، کسر وانکسار، ایک دوسرے کے جذبات کا پاس ولحاظ اور خیر خواہی کا ضروری حد تک اہتمام کریں۔ نبی ﷺ کے چند واقعات سے اندازہ کیجیے کہ آپ کس عالی ظرفی، فراخ دلی، تحمل وبردباری اور رواداری کے ساتھ لوگوں کی فطری ضروریات، جذبات اور کمزوریوں کا لحاظ فرماتے تھے۔ "میں نماز کے لیے آتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ لمبی نماز پڑھاؤں پھر کسی بچے کے رونے کی آواز کان میں آتی ہے تو میں نماز کو مختصر کر دیتا ہوں کیونکہ مجھ پر یہ بات انتہائی گراں ہے کہ میں نماز کو طول دے کر بچے کی ماں کو زحمت میں مبتلا کروں۔" (بخاری)

حضرت مالک بن الحویرثؓ فرماتے ہیں کہ "ہم چند ہم عمر نوجوان دین کا علم حاصل کرنے کے لیے نبی ﷺ کے یہاں پہنچے۔ ہم نے بیس دن آپ ﷺ کے یہاں قیام کیا، نبی ﷺ انتہائی رحیم ونرم معاملہ کرنے والے تھے۔ (جب آپ ﷺ کے یہاں رہتے ہوئے ہمیں بیس دن ہو گئے تو) آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ ہم گھر جانے کے شوق میں ہیں تو آپ ﷺ نے ہم سے پوچھا تم اپنے گھروں میں اپنے پیچھے کن کن لوگوں کو چھوڑ آئے ہو۔ ہم نے گھر کے حالات بتائے تو آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ اپنے بیوی بچوں میں واپس جاؤ اور ان کے درمیان رہ کر انہیں بھی وہ سکھاؤ جو تم نے سیکھا ہے۔ اور انہیں بھلے کاموں کی تلقین کرو اور فلاں فلاں نماز فلاں وقت پڑھو اور جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی اذان دے دے اور جو تم لوگوں میں علم واخلاق کے لحاظ سے بڑھا ہوا ہو وہ نماز پڑھائے۔" (بخاری، مسلم)

حضرت معاویہ بن حکم سلمیؓ اپنا قصہ سناتے ہیں کہ "میں نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں ایک آدمی کو چھینک آئی، نماز پڑھتے ہی میری زبان سے: یرحمک اللہ "نکل گیا تو لوگ مجھے گھورنے لگے میں نے کہا خدا تمہیں سلامت رکھے مجھے کیوں گھور رہے ہو! پھر جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے خاموش رہنے کو کہہ رہے ہیں تو میں خاموش ہو گیا جب نبی ﷺ نماز سے فارغ ہو گے.........میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان میں نے نبی ﷺ سے زیادہ بہتر تعلیم وتربیت کرنے والا نہ تو پہلے دیکھا نہ بعد میں۔ آپ ﷺ نے نہ تو مجھے ڈانٹا، نہ مارا اور نہ برا بھلا کہا، صرف اتنا کہا: "یہ نماز ہے، نماز میں بات چیت کرنا مناسب نہیں۔ نماز تو نام ہے خدا کی پاکی بیان کرنے کا، اس کی بڑائی بیان کرنے کا اور قرآن پڑھنے کا۔" (مسلم)

۲۱۔ دعا کا خصوصی اہتمام کیجیے خود بھی دوستوں کے لیے دعا کیجیے اور ان سے بھی دعا کی درخواست کیجیے۔ دعا دوستوں کے سامنے بھی کیجیے اور ان کی عدم موجودگی میں بھی، عدم موجودگی میں دوستوں کا خیال کر کے اور ان کا نام لے کر بھی دعا کیجیے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں: "میں نے نبی ﷺ سے عمرہ کی اجازت چاہی۔" آپ ﷺ نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا: "اے میرے بھائی اپنی دعاؤں میں ہمیں نہ بھولنا۔" حضرت عمرؓ کہتے ہیں: "مجھے اس بات سے اتنی خوشی ہوئی کہ اگر اس کے بدلے مجھے پوری دنیا بھی ملتی تو اتنی خوشی نہ ہوتی۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لیے غائبانہ دعا کرتا ہے تو خدا اس کو قبول فرماتا ہے اور دعا کرنے والے کے سرہانے ایک فرشتہ مقرر رہتا ہے کہ جب وہ شخص اپنے بھائی کے لیے اچھی دعا کرتا ہے تو فرشتہ آمین کہتا ہے اور کہتا ہے تیرے لیے بھی وہی کچھ ہے جو تو اپنے بھائی کے لیے مانگ رہا ہے۔" (صحیح مسلم)

اپنی مخلصانہ دعاؤں میں خدا سے درخواست کرتے رہیے کہ خدایا! ہمارے دلوں سے بغض و عناد اور کدورتوں کو غبار سے دھو دے اور ہمارے سینوں کو خلوص و محبت سے جوڑ دے اور ہمارے تعلقات کو باہمی اتحاد و الفت کے ذریعے خوشگوار بنا۔

قرآن پاک کی اس دعا کا بھی اہتمام کیجیے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ

"اے ہمارے رب! ہماری اور ہمارے بھائیوں کی مغفرت فرما جو ایمان میں ہم سے سبقت لے گئے اور ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کینہ اور کدورت نہ رہنے دے۔ اے ہمارے رب! تو بڑا ہی مہربان اور بہت ہی رحم فرمانے والا ہے۔"

میزبانی کے آداب

۱۔ مہمان کے آنے پر خوشی اور محبت کا اظہار کیجیے اور نہایت خوش دلی، مسرت قلب اور عزت و اکرام کے ساتھ اس کا استقبال کیجیے۔ تنگ دلی، بے رخی، سرد مہری، اور کڑھن کا اظہار ہرگز نہ کیجیے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "جو لوگ خدا اور یوم آخر پر یقین رکھتے ہیں انہیں اپنے مہمان کی خاطر تواضع کرنی چاہیے۔" (بخاری، مسلم)

خاطر تواضع کرنے میں وہ ساری ہی باتیں داخل ہیں جو مہمان کے اعزاز و اکرام، آرام و راحت، سکون و مسرت اور تسکین جذبات کے لیے ہوں، خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آنا، ہنسی خوشی کی باتوں سے دل بہلانا، عزت و اکرام کے ساتھ بیٹھنے لیٹنے کا انتظام کرنا۔ اپنے معزز دوستوں سے تعارف اور ملاقات کرانا، اس کی ضروریات کا لحاظ رکھنا، نہایت خوش دلی اور فراخی کے ساتھ کھانے پینے کا انتظام کرنا اور خود بنفس نفیس خاطر مدارت میں لگے رہنا یہ سب ہی باتیں "اکرام ضیف" میں داخل ہیں۔

"نبی ﷺ کے پاس جب معزز مہمان آتے تو آپ ﷺ خود بنفس نفیس ان کی خاطر داری فرماتے۔"

جب آپ ﷺ مہمان کو اپنے دستر خوان پر کھانا کھلاتے تو بار بار فرماتے: "اور کھایئے اور کھایئے۔" جب مہمان خوب آسودہ ہو جاتا اور انکار کرتا تب آپ ﷺ اصرار سے باز آتے۔

۲۔ مہمان کے آنے پر سب سے پہلے اس سے سلام دعا کیجیے اور خیر وعافیت معلوم کیجیے۔ قرآن میں ہے:

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ (سورہ الذاریات)

"کیا آپ کو ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی پہنچی ہے کہ جب وہ ان کے پاس آئے تو آتے ہی سلام کیا۔ ابراہیمؑ نے جواب میں سلام کیا۔"

۳۔ دل کھول کر مہمان کی خاطر تواضع کیجیے اور جو اچھے سے اچھا میسر ہو مہمان کے سامنے فوراً پیش کیجیے۔ حضرت ابراہیمؑ کے مہمان جب آئے تو حضرت ابراہیمؑ فوراً ان کے کھانے پینے کے انتظام میں لگ گئے اور جو موٹا تازہ بچھڑا انہیں میسر تھا اسی کا گوشت بھون کر مہمانوں کی خدمت میں پیش کیا۔

قرآن میں ہے:

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ

"تو جلدی سے گھر میں جا کر ایک موٹا تازہ بچھڑا (ذبح کر کے بھنوا) لائے اور مہمانوں کے سامنے پیش کیا۔"

" فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ " کا مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ چپکے سے گھر میں مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کا انتظام کرنے کے لیے چلے گئے اس لیے کہ مہمانوں کو دکھا کر اور جتا کر ان کے کھانے پینے اور خاطر تواضع کرنے کی دوڑ دھوپ ہو گی تو وہ شرم اور میز بان کی تکلیف کی وجہ سے منع کریں گے اور پسند نہ کریں گے کہ ان کی وجہ سے میز بان کسی غیر معمولی زحمت میں پڑے اور پھر میز بان کے لیے مواقع نہ ہو گا کہ وہ خاطر خواہ خاطر داری کر سکے۔

نبی ﷺ نے مہمان کی خاطر داری پر جس انداز سے ابھارا ہے اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے حضرت ابو شریحؓ فرماتے ہیں:

"میری ان دو آنکھوں نے دیکھا اور ان دو کانوں نے سنا جب کہ نبی ﷺ یہ ہدایت دے رہے تھے۔ جو لوگ خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، انہیں اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنی چاہیے مہمان کے انعام کا موقع پہلا شب و روز ہے۔" (بخاری، مسلم)

پہلے شب و روز کی میز بانی کو انعام سے تعبیر کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح انعام دینے والا دل کی انتہائی خوشی اور محبت کے گہرے جذبات کے ساتھ انعام دیتے ہوئے روحانی سرور محسوس کرتا ہے، ٹھیک یہی کیفیت پہلے شب و روز مین میز بان کی ہونی چاہیے اور جس طرح انعام لینے والا مسرت و شادمانی کے جذبات سے سرشار انعام دینے والے کے احساسات کی قدر کرتے ہوئے اپنا حق سمجھ کو انعام

وصول کرتا ہے، ٹھیک اسی کیفیت کا مظاہرہ پہلے شب وروز میں مہمان کو بھی کرنا چاہیے اور بغیر کسی جھجک کے اپنا حق سمجھتے ہوئے خوشی اور قربت کے جذبات کے ساتھ میزبان کی پیش کش قبول کرنی چاہیے۔

۴۔ مہمان کے آتے ہی اس کی انسانی ضرورتوں کا احساس کیجیے۔ رفع حاجت کے لیے پوچھیے۔ منہ ہاتھ دھونے کا انتظام کیجیے، ضرورت ہو تو غسل کا انتظام بھی کیجیے، کھانے پینے کا وقت نہ ہو جب بھی معلوم کیجیے اور اس خوش اسلوبی سے کہ مہمان تکلف میں انکار نہ کرے کمرے میں لیٹنے بیٹھنے کا جو نظم ہو وہ مہمان کو بتا دیجیے۔

۵۔ ہر وقت مہمان کے پاس دھرنا مارے بیٹھے نہ رہیے اور اسی طرح رات گئے تک مہمان کو پریشان نہ کیجیے، تاکہ مہمان کو آرام کرنے کا موقع ملے اور وہ پریشانی محسوس نہ کرے۔ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جب مہمان آئے تو ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لیے مہمانوں سے کچھ دیر کے لیے لگ ہو گئے۔

۶۔ مہمانوں کے کھانے پینے پر مسرت محسوس کیجیے، تنگ دلی، کڑھن اور کوفت محسوس نہ کیجیے۔ مہمان زحمت نہیں بلکہ رحمت اور خیر و برکت کا ذریعہ ہوتا ہے اور خدا جس کو آپ کے یہاں بھیجتا ہے اس کا رزق بھی اتار دیتا ہے، وہ آپ کے دستر خوان پر آپ کی قسمت کا نہیں کھاتا بلکہ اپنی قسمت کا کھاتا ہے اور آپ کے اعزاز و اکرام میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

۷۔ مہمان کی عزت وآبرو کا بھی لحاظ رکھیے اور اس کی عزت وآبرو کو اپنی عزت وآبرو سمجھیے۔آپ کے مہمان کی عزت پر کوئی حمہ کرے تو اس کو اپنی غیرت و حمیت کے خلاف چیلنج سمجھیے۔

قرآن میں ہے کہ جب حضرت لوطؑ کے مہمانوں پر بستی کے لوگ بدنیتی کے ساتھ حملہ آور ہوئے تو وہ مدافعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: "یہ لوگ میرے مہمان ہیں ان کے ساتھ بدسلوکی کر کے مجھے رسوانہ کرو، ان کی رسوائی میری رسوائی ہے۔"

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِۙ۝۶۸ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ۝۶۹

"لوطؑ نے کہا: "بھائیو! یہ میرے مہمان ہیں مجھے رسوا نہ کرو۔ خدا سے ڈرو اور میری بے عزتی سے باز رہو۔"

۸۔ تین دن تک انتہائی شوق و ولولے کے ساتھ میزبانی کے تقاضے پورے کیجیے۔ تین دن کی ضیافت مہمان کا حق ہے اور حق ادا کرنے میں مومن کو انتہائی فراخ دل ہونا چاہیے۔ پہلا دن خصوصی خاطر مدارت کا ہے اس لیے پہلے روز مہمان نوازی کا پورا پورا اہتمام کیجیے...... بعد کے دو دنوں میں اگر وہ غیر معمولی اہتمام نہ رہ سکے تو کوئی مضائقہ نہیں، نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

والضیافۃ ثلاثۃ ایام فما بعد ذالک فھو لہ صدقۃ (بخاری، مسلم)

"اور مہمان نوازی تین دن تک ہے اس کے بعد میزبان جو کچھ کرے گا وہ اس کے لیے صدقہ ہو گا۔"

۹۔ مہمان کی خدمت کو اپنا اخلاقی فرض کیجیے اور مہمان کو ملازموں یا بچوں کے حوالے کرنے کے بجائے خود اس کی خدمت اور آرام کے لیے کمر بستہ رہیے۔ نبی ﷺ معزز مہمانوں کی مہمان نوازی خود فرماتے تھے حضرت امام شافعیؒ جب امام مالکؒ کے ہاں جا کر بطور مہمان ٹھہرے تو امام مالکؒ نے نہایت عزت و احترام سے انہیں ایک کمرے میں سلا دیا۔ سحر کے وقت امام شافعیؒ نے سنا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور بڑی ہی شفقت سے آواز دی: "آپ پر خدا کی رحمت ہو نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" امام شافعیؒ فوراً اٹھے کیا دیکھتے ہیں کہ امام مالک ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا لیے کھڑے ہیں امام شافعیؒ کو کچھ شرم سی محسوس ہوئی۔ امام مالکؒ تاڑ گئے اور نہایت محبت کے ساتھ بولے: "بھائی! تم کوئی خیال نہ کرو۔ مہمان کی خدمت تو کرنا ہی چاہیے۔"

۱۰۔ مہمان کو ٹھہرانے کے بعد، بیت الخلاء بتادیجیے۔ پانی کا لوٹا دے دیجیے، قبلے کا رخ بتادیجیے، نماز کی جگہ اور مصلے وغیرہ مہیا کر دیجیے۔ امام شافعیؒ کو امام مالکؒ کے خادم نے ایک کمرے میں ٹھہرانے کے بعد کہا: "حضرت قبلہ کا رخ یہ ہے، پانی کا برتن یہاں رکھا ہے، بیت الخلاء اس طرف ہے۔"

۱۱۔ کھانے کے لیے جب ہاتھ دھلائیں تو پہلے خود ہاتھ دھو کر دستر خوان پر پہنچیے اور پھر مہمان کے ہاتھ دھلوائے، امام مالکؒ نے جب یہی عمل کیا، تو امام شافعیؒ نے اس کی وجہ پوچھی، تو فرمایا: "کھانے سے پہلے میزبان کو پہلے ہاتھ دھونا چاہیے اور دستر خوان پر پہنچ کر مہمان کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اور کھانے کے بعد مہمانوں کے ہاتھ دھلوانے چاہئیں اور سب کے بعد میزبان کو ہاتھ دھونے چاہئیں ہو سکتا ہے کہ اٹھتے اٹھتے کوئی اور پہنچے۔

۱۲۔ دستر خوان پر خورد و نوش کا سامان اور برتن وغیرہ مہمان کی تعداد سے کچھ زیادہ رکھیے ہو سکتا ہے کہ کھانے کے دوران کوئی اور صاحب آجائیں اور پھر ان کے لیے انتظام کرنے کو دوڑنا بھاگنا پڑے اور اگر برتن اور سامان پہلے سے موجود ہو گا تو آنے والا بھی سبکی کے بجائے مسرت اور عزت افزائی محسوس کرے گا۔

۱۳۔ مہمان کے لیے ایثار سے کام لیجیے۔ خود تکلیف اٹھا کر اس کو آرام پہنچایئے۔

ایک مرتبہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور بولا حضور ﷺ! میں بھوک سے بے تاب ہوں، آپ ﷺ نے اپنی کسی بیوی کے یہاں کہلایا، کھانے کے لیے جو کچھ موجود ہے بھیج دو۔ جواب آیا، اس خدا کی قسم جس نے آپ ﷺ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے یہاں تو پانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے پھر آپ ﷺ نے دوسری بیوی یہاں کہلا بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ایک ایک کر کے سب بیویوں کے یہاں کہلوایا اور سب کے یہاں سے اسی طرح کا جواب آیا۔

اب آپ ﷺ اپنے صحابیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا آج رات کے لیے کون اس مہمان کو قبول کرتا ہے۔ ایک انصاری صحابیؓ نے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ! میں قبول کرتا ہوں۔

انصاری مہمان کو اپنے گھر لے گئے اور گھر جا کر بیوی کو بتایا: "میرے ساتھ یہ رسول اللہ ﷺ کے مہمان ہیں ان کی خاطر داری کرو۔" بیوی نے کہا: "میرے پاس تو صرف بچوں کے لائق کھانا ہے۔" صحابیؓ نے کہا: "بچوں کو کسی طرح بہلا کر سلا دو اور جب مہمان کے سامنے کھانا رکھو تو کسی بہانے چراغ بجھا دینا اور کھانے پر مہمان کے ساتھ بیٹھ جانا تا کہ اس کو محسوس ہو کہ ہم بھی کھانے میں شریک ہیں۔"

اس طرح مہمان نے تو پیٹ بھر کر کھایا اور گھر والوں نے ساری رات فاقے سے گزاری۔ صبح جب یہ صحابیؓ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے دیکھتے ہی فرمایا: تم دونوں نے رات اپنے مہمان کے ساتھ جو حسن سلوک کیا وہ خدا کو بہت ہی پسند آیا۔ (بخاری، مسلم)

۱۴۔ اگر آپ کے مہمان نے کبھی کسی موقع پر آپ کے ساتھ بے مروتی اور روکھے پن کا سلوک کیا ہو تب بھی آپ اس کے ساتھ نہایت فراخ دل، وسعتِ ظرف اور فیاضی کا سلوک کیجیے۔

حضرت ابوالاحوص جشمیؓ اپنے والد کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ایک بار انہوں نے نبی ﷺ سے پوچھا: "اگر کسی کے پاس میرا گزر ہو اور وہ میری ضیافت اور مہمان کا حق ادا نہ کرے اور پھر کچھ دنوں کے بعد اس کا گزر میرے پاس ہو تو کیا میں اس کی مہمانی کا حق ادا کروں؟ یا اس (بے مروتی اور بے رخی) کا بدلہ اسے چکھاؤں؟ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "نہیں بلکہ تم بہر حال اس کی مہمانی کا حق ادا کرو۔" (مشکوٰۃ)

۱۵۔ مہمان سے اپنے حق میں خیر و برکت کی دعا کے لیے درخواست کیجیے بالخصوص اگر مہمان نیک، دیندار اور صاحب فضل ہو۔ حضرت عبداللہ بن بسرؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ میرے والد کے یہاں مہمان ٹھہرے۔ ہم نے آپ ﷺ کے سامنے ہریسہ پیش کیا۔ آپ ﷺ نے تھوڑا سا تناول فرمایا پھر ہم نے کھجوریں پیش کیں، آپ ﷺ کھجوریں کھاتے تھے اور گٹھلیاں شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی میں پکڑ پکڑ کر پھینکتے جاتے تھے پھر پینے کے لیے کچھ پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے نوش فرمایا اور اپنے دائیں طرف بیٹھنے والے کے آگے بڑھا دیا جب آپ ﷺ تشریف لے جانے لگے تو والد محترم نے آپ ﷺ کی سواری کی لگام پکڑ لی اور درخواست کی کہ حضور ﷺ ہمارے لیے دعا فرمائیں......... اور نبی ﷺ نے دیا فرمائی

اللھم بارك لھم فیما رزقتھم واغفرلھم وارحمھم

"خدایا! تو نے ان کو جو رزق دیا ہے اس میں برکت فرما۔ ان کی مغفرت فرما اور ان پر رحم کر۔"

## مہمانی کے آداب

۱۔ کسی کے یہاں مہمان جائیں تو حسب حیثیت میزبان، یا میزبان کے بچوں کے لیے کچھ تحفے تحائف لیتے جائیے اور تحفے میں میزبان کے ذوق اور پسند کا لحاظ کیجیے۔ تحفوں اور ہدیوں کے تبادلے سے محبت اور تعلق کے جذبات بڑھتے ہیں اور تحفہ دینے والے کے لیے دل میں گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

فاذا قضیتم مناسککم فاذ کروا اللہ کذ کر کم ابائکم او اشد اذ کرا۔

"پھر جب تم حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ واجداد کا ذکر کرتے تھے اسی طرح اب خدا کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔"

حج کے ارکان کا مقصود ہی یہ ہے کہ آپ ان ایام میں مسلسل خدا کی یاد میں ڈوبے رہیں اور ان دنوں میں اس کی یاد اس طرح دل میں رچ بس جائے کہ پھر زندگی کی ہماہمی اور کشمکش میں کوئی چیز اس کی یاد سے آپ کو غافل نہ کر سکے۔ جاہلیت کے دور میں لوگ ارکان حج ادا کرنے کے بعد اپنے باپ کی دادا کی بڑھائی بیان کرتے اور ڈینگیں مارتے تھے۔ خدا نے ہدایت دی کہ یہ ایام خدا کی یاد میں بسر کرو اور اسی کی بڑائی کرو جو واقعی بڑا ہے۔۱۸۔ خدا کے گھر کا پروانہ وار طواف کیجیے، خدا کا ارشاد ہے:

"اور چاہیے کہ بیت اللہ کا طواف کریں۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "خدا ہر روز اپنے حاجی بندوں کے لیے ایک سو بیس رحمتیں نازل فرماتا ہے جس میں سے ساٹھ رحمتیں ان کے لیے ہوتی ہیں جو بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، چالیس ان کے لیے جو وہاں نماز پڑھتے ہیں اور بیس ان لوگوں کے لیے جو کعبے کو دیکھتے رہتے ہیں۔" (بیہقی)

اور نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا: "جس نے پچاس بار بیت اللہ کا طواف کر لیا وہ اپنے گناہوں سے ایسے پاک ہو گیا جیسے اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنم دیا ہے۔" (ترمذی)

# تزئین معاشرت

## والدین سے سلوک کے آداب

۱۔ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کیجیے اور اس حسن سلوک کی توفیق کو دونوں جہانوں کی سعادت سمجھیے، خدا کے بعد انسان پر سب سے زیادہ حق ماں باپ کا ہی ہے۔ ماں باپ کے حق کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ قرآن پاک نے جگہ جگہ ماں باپ کے حق کو خدا کے حق کے ساتھ بیان کیا ہے اور خدا کی شکر گزاری کے ساتھ ساتھ ماں باپ کی شکر گزاری کی تاکید کی ہے۔

وقضی ربك الا تعبدوا الا ایاہ و بالوالدین احسانا (بنی اسرائیل)

"اور آپ کے رب نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں: "میں نے نبی ﷺ سے پوچھا کون سا عمل خدا کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا "وہ نماز جو وقت پر پڑھی جائے۔ میں نے (پھر) پوچھا: اس کے بعد کون سا عمل خدا کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ فرمایا: ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک۔ میں پوچھا اس کے بعد، فرمایا: خدا کی راہ میں جہاد کرنا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: "میں آپ کے ہاتھ پر ہجرت اور جہاد کے لیے بیعت کرتا ہوں اور خدا سے اس کا اجر چاہتا ہوں۔ نبی ﷺ نے پوچھا: "کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی ایک زندہ ہے اس نے کہا: "جی ہاں بلکہ (خدا کا شکر ہے) دونوں زندہ ہیں "آپ نے فرمایا تو کیا تم واقعی خدا سے اپنی ہجرت اور جہاد کا بدلہ چاہتے ہو؟ اس نے کہا جی ہاں میں خدا سے اجر چاہتا ہوں، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا تو جاؤ اپنے ماں باپ کی خدمت میں رہ کر ان کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ (مسلم)

حضرت ابوامہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے پوچھا "یارسول اللہ ﷺ ! ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے

؟ارشاد فرمایا "ماں باپ ہی تمہاری جنت ہیں اور ماں باپ ہی دوزخ "۔ (ابن ماجہ)

یعنی ان کے ساتھ نیک سلوک کر کے تم جنت کے مستحق ہوگے اور ان کے حقوق کو پامال کر کے تم جہنم کا ایندھن بنو گے۔

۲۔ والدین کے شکر گزار رہیے۔ محسن کی شکر گزاری اور احسان مندی زارفت کا اولین تقاضا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے وجود کا محسوس سبب والدین ہیں۔ پھر والدین ہی کی پرورش اور نگرانی میں ہم پلتے بڑھتے اور شعور کو پہنچتے ہیں اور جس غیر معمولی قربانی، بے مثال جانفشانی اور انتہائی شفقت سے ہماری سرپرستی فرماتے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ ہمارا سینہ ان کی عقیدت مندی و احسان مندی اور عظمت و محبت سے سرشار ہو اور ہمارے دل کا ریشہ ریشہ ان کا شکر گزار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے اپنی شکر گزاری کے ساتھ ساتھ ان کی شکر گزاری کی تاکید فرمائی ہے۔

ان اشکرلی والوالدیك (ہم نے وصیت کی) کہ میرا شکر ادا کرو اور اپنے ماں باپ کے شکر گزار رہو۔

۳۔ ماں باپ کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کیجیے اور ان کی مرضی اور مزاج کے خلاف کبھی کوئی ایسی بات نہ کہیے

جو ان کو ناگوار ہو۔ بالخصوص بڑھاپے میں جب مزاج کچھ چڑچڑا اور کھرا ہو جاتا ہے اور والدین کچھ ایسے تقاضے اور مطالبے کرنے لگتے ہیں جو توقع کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ہر بات کو خوشی خوشی برداشت کیجیے اور ان کی کسی بات سے اکتا کر جواب میں کوئی ایسی بات ہرگز نہ کیجیے جو ان کو ناگوار ہو اور ان کے جذبات کو ٹھیس لگے

اما یبلغن عندك الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما۔

اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو تم ان کو اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑکیاں دو۔

دراصل بڑھاپے کی عمر میں بات کی برداشت نہیں رہتی اور کمزوری کے باعث اپنی اہمیت کا احساس بڑھ جاتا ہے،اسی لیے ذرا ذرا سی بات بھی بڑی محسوس ہونے لگتی ہے۔ لہذااس نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے کسی قول و عمل سے ماں باپ کو ناراض ہونے کا موقع نہ دیجیے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خدا کی خوشنودی والد کی خوشنودی میں ہے اور خدا کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔(ترمذی،ابن حبان،حاکم)

یعنی اگر کوئی اپنے خدا کو خوش رکھنا چاہے تو وہ اپنے والد کو خوش خوش رکھے،والد کو ناراض کرکے وہ خدا کے غضب کو بھڑکائے گا۔

حضرت عبداللہؓ ہی کا بیان ہے کہ ایک آدمی اپنے ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر نبی ﷺ کی خدمت میں ہجرت پر بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا "جاؤ اپنے ماں باپ کے پاس واپس جاؤ اور ان کو اسی طرح خوش کرکے آؤ جس طرح تم ان کو رلا کر آئے ہو۔"(ابو دؤد)

۴۔ دل و جان سے ماں باپ کی خدمت کیجیے۔ اگر آپ کو خدا نے اس کا موقع دیا تو دراصل یہ اس بات اس توفیق ہے کہ آپ خود کو جنت کا مستحق بنا سکیں اور خدا کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ ماں باپ کی خدمت سے ہی دونوں جہاں کی بھلائی،سعادت اور عظمت حاصل ہوتی ہے اور آدمی دونوں جہاں کی آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔

"جو آدمی چاہتا ہے کہ اس کی عمر دراز کی جائے اور اس کی روزی میں کشادگی ہو،اس کو چاہیے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے اور صلہ رحمی کرے۔(الترغیب والترہیب)

اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے

"وہ آدمی ذلیل ہو، پھر ذلیل ہو، پھر ذلیل ہو۔ لوگوں نے پوچھا،اے خدا کے رسول ﷺ! کون آدمی؟ آپ نے فرمایا وہ آدمی جس نے اپنے ماں باپ کو بڑھاپے کی حالت میں پایا،دونوں کو پایا،یا کسی ایک کو اور پھر (ان کی خدمت کرکے) جنت میں داخل نہ ہوا۔" (مسلم)

ایک موقع پر تو آپ نے خدمت والدین کو جہاد جیسی عظیم عبادت پر بھی ترجیح دی اور ایک صحابی کو جہاد میں جانے سے روک کر والدین کی خدمت کی تاکید فرمائی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس جہاد میں شریک ہونے کی غرض سے حاضر ہوا۔ نبی ﷺ نے اس سے پوچھا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں۔ اس نے کہا جی ہاں زندہ ہیں۔ ارشاد فرمایا جاؤ اور ان کی خدمت کرتے رہو یہی جہاد ہے (بخاری و مسلم)

۵۔ ماں باپ کا ادب و احترام کیجیے اور کوئی بھی ایسی بات یا حرکت نہ کیجیے جو ان کے احترام کے خلاف ہو۔ قرآن میں ہے وقل لهما قولا کریما (بنی اسرائیل:۲۳)

اوران سے احترام کی بات کیجیے۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت ابن عباس سے پوچھا کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ جہنم سے دور رہیں اور جنت میں داخل ہوں ؟ابن عباس نے کہا کیوں نہیں، خدا کی قسم میں یہی چاہتا ہوں۔ حضرت ابن عمرؓ نے پوچھا، آپ کے والدین زندہ ہیں ؟ابن عباسؓ نے کہا جی ہاں میری والدہ زندہ ہیں۔ابن عمرؓ نے فرمایا اگر آپ ان کے ساتھ نرمی سے گفتگو کریں، ان کے کھانے پینے کا خیال رکھیں تو ضرور جنت میں جائیں گے بشر طیکہ آپ کبیرہ گناہوں سے بچتے رہیں۔(الادب المفرد)

حضرت ابوہریرہؓ نے ایک بار دو آدمیوں کو دیکھا۔ایک سے پوچھا یہ دوسرے تمہارے کون ہیں ؟اس نے کہا یہ میرے والد ہیں آپ نے فرمایا دیکھو! نہ ان کا نام لینا، نہ کبھی ان سے آگے آگے چلنا اور نہ کبھی ان سے پہلے بیٹھنا۔(الادب المفرد)٦۔والدین کے ساتھ عاجزی اور انکساری سے پیش آیئے۔

واحفض لهما جناح الذل من الرحمة

"اور عاجزی اور نرمی سے ان کے سامنے بچھے رہو۔"

عاجزی سے بچھے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت ان کے مرتبہ کا لحاظ رکھو اور کبھی ان کے سامنے اپنی بڑائی نہ جتاؤ اور نہ ان کی شان میں گستاخی کرو۔

٧۔والدین سے محبت کیجیے اور اس کو اپنے لیے باعث سعادت و اجر آخرت سمجھیے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ فرماتے ہیں۔

"جو نیک اولاد بھی ماں باپ پر محبت بھری نظر ڈالتی ہے، اس کے بدلے خدا اس کو ایک حج مقبول کا ثواب بخشتا ہے "لوگوں نے پوچھا اے خدا کے رسول ﷺ! اگر کوئی ایک دن میں سو بار اس طرح رحمت و محبت کی نظر ڈالے۔آپ نے فرمایا جی ہاں، اگر کوئی سو بار ایسا کرے تب، خدا (تمہارے تصور سے) بہت بڑا اور (تنگ دلی جیسے عیبوں سے) بالکل

پاک ہے۔(مسلم)

٨۔ماں باپ کی دل و جان سے اطاعت کیجیے۔اگر وہ کچھ زیادتی بھی کر رہے ہوں تب بھی خوشدلی سے اطاعت کیجیے اور ان کے عظیم احسانات کو پیش نظر رکھ کر ان کے وہ مطالبے بھی خوشی خوشی پورے کیجیے جو آپ کے ذوق اور مزاج پر گراں ہوں بشر طیکہ وہ دین کے خلاف نہ ہوں۔

حضرت ابوسعیدؓ کا بیان ہے کہ یمن کا ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔نبی ﷺ نے اس سے پوچھا:"یمن میں تمہارا کوئی ہے ؟اس نے کہا (جی ہاں) میرے ماں باپ ہیں۔آپ نے پوچھا، انہوں نے تمہیں اجازت دی ہے ؟اس نے کہا نہیں،،(میں نے ان سے تو

اجازت نہیں لی ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: "اچھا تو تم واپس جاؤ اور ماں باپ سے اجازت لو، اگر وہ اجازت دے دیں تب تو جہاد میں شرکت کرو ورنہ (ان کی خدمت میں رہ کر) ان کے ساتھ سلوک کرتے رہو۔" (ابو داؤد)

والدین کی اطاعت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ ایک شخص میلوں دور سے آتا ہے اور چاہتا ہے کہ نبی ﷺ کی معیت میں دین کی سربلندی کے لیے جہاد میں شریک ہو لیکن نبی ﷺ اس کو لوٹا دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ جہاد میں شرکت بھی تم اسی صورت میں کر سکتے ہو جب تمہارے ماں باپ دونوں تمہیں اجازت دیں۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے اس حال میں صبح کی کہ وہ ان ہدایات واحکام میں خدا کا اطاعت گزار رہا ہو جو اس نے ماں باپ کے حق میں نازل فرمائے ہیں تو اس نے اس حال میں صبح کی کہ اس کے لیے جنت کے دو دروازے کھلے ہوئے ہیں اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہو تو جنت کا ایک دروازہ کھلا ہوا ہے اور جس شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ ماں باپ کے بارے میں خدا کے بھیجے ہوئے احکام وہدایات سے منہ موڑے ہوئے ہے تو اس نے اس حال میں صبح کی کہ اس کے لیے دوزخ کے دو دروازے کھلے ہوئے ہیں اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہے تو دوزخ کا ایک دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس آدمی نے پوچھا اے خدا کے رسول ﷺ اگر ماں باپ اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہوں تب بھی۔ فرمایا ہاں اگر وہ زیادتی کر رہے ہوں تب بھی، اگر زیادتی کر رہے ہوں تب بھی، اگر زیادتی کر رہے ہوں تب بھی۔ (مشکوۃ)

۹۔ ماں باپ کو اپنے مال کا مالک سمجھئے اور ان پر دل کھول کر خرچ کیجیے۔ قرآن میں ہے:

یسئلونك ماذا ینفقون ط قل ما انفقتم من خیر فللوالدین۔ (البقرہ)

"لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں، جواب دیجیے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اس کے اولین حقدار والدین ہیں۔"

ایک بار نبی ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور اپنے باپ کی شکایت کرنے لگا کہ وہ جب چاہتے ہیں میرا مال لے لیتے ہیں۔ نبی ﷺ نے اس آدمی کے باپ کو بلوایا، لاٹھی ٹیکتا ہوا ایک بوڑھا کمزور شخص حاضر ہوا، آپ نے اس بوڑھے شخص سے تحقیق فرمائی تو اس نے کہنا شروع کیا:

"خدا کے رسول ﷺ! ایک زمانہ تھا جب یہ کمزور اور بے بس تھا اور مجھ مین طاقت تھی، میں مالدار تھا اور یہ خالی ہاتھ تھا۔ میں نے کبھی اس کو اپنی چیز لینے سے نہیں روکا، آج میں کمزور ہوں اور یہ تندرست و قوی ہے، میں خالی ہاتھ ہوں اور یہ مالدار ہے، اب یہ اپنا مال مجھ سے بچا بچا کر رکھتا ہے۔"

بوڑھے کی یہ بات سن کر رحمت عالم رو پڑے اور (بوڑھے کے لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر) فرمایا: تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔

۱۰۔ ماں باپ اگر غیر مسلم ہوں تب بھی ان کے ساتھ سلوک کیجیے، ان کا ادب واحترام اور ان کی خدمت برابر کرتے رہیے۔ البتہ وہ شرک و معصیت کا حکم دیں تو ان کی اطاعت سے انکار کر دیجیے اور ان کا کہنا ہرگز نہ مانیے۔

وان جاهداك علی ان تشرك بی ما لیس لك به علم فلا تطعهما وصاحبهما فی الدنیا معروفا۔

اور اگر ماں باپ دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک بناؤ جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے تو ہر گز ان کا کہنا نہ مانو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہو۔

حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ کے عہد مبارک میں میرے پاس میری والدہ آئیں اور اس وقت وہ مشرکہ تھیں۔ میں نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ میرے پاس میری والدہ آئیں ہیں اور وہ اسلام سے متنفر ہیں، کیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں تم اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرتی رہو۔ (بخاری)

۱۱۔ ماں باپ کے لیے برابر دعا بھی کرتے رہیے اور ان کے احسانات کو یاد کر کے خدا کے حضور گڑ گڑائیے اور انتہائی دل سوزی اور قلبی جذبات کے ساتھ ان کے لیے رحم و کرم کی درخواست کیجیے، خدا کا ارشاد ہے:

وقل رب ارحمهما كما ربينی صغيرا

"اور دعا کرو کہ پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما، جس طرح ان دونوں نے بچپن میں میری پرورش فرمائی تھی۔،،

یعنی اے پروردگار بچپن کی بے بسی میں، جس رحمت اور جانفشانی و شفقت و محبت سے انہوں نے میری پرورش کی اور میری خاطر اپنے عیش کو قربان کیا۔ پروردگار! میں ان کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا، تو ہی ان کی سرپرستی فرما، اور ان کے حال زار پر رحم کی نظر کر۔

۱۲۔ ماں کی خدمت کا خصوصی خیال رکھیے، ماں طبعاً زیادہ کمزور اور حساس ہوتی ہے اور آپ کے خدامت و سلوک کی نسبتاً زیادہ ضرورت مند بھی۔ پھر اس کے احسانات اور قربانیاں بھی باپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں اس لیے دین نے ماں کا حق زیادہ بتایا ہے اور ماں کے ساتھ سلوک کی خصوصی ترغیب دی ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

ووصينا الانسان بوالديه احسانا ط حملته كرها ووضعته كرها وحمله وفصاله ثلثون شهرا (الاحقاف)

"اور ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنے کی تاکید کی، اس کی ماں تکلیف اٹھا اٹھا کر اس کو پیٹ میں لیے پھری اور تکلیف ہی سے جنا اور پیٹ میں اٹھانے اور دودھ پلانے کی یہ (تکلیف دہ) مدت ڈھائی سال ہے۔"

قرآن نے ماں باپ دونوں کے ساتھ سلوک کرنے کی تاکید کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ماں کے پیہم دکھ اٹھانے اور کٹھنائیاں جھیلنے کا نقشہ بڑے ہی اثر انگیز انداز میں کھینچا ہے اور نہایت ہی خوبی کے ساتھ نفسانی انداز میں اس حقیقت کی طرف اشاری کیا ہے کہ جان نثار ماں، باپ کے مقابلے میں تمہاری خدمت و سلوک کی زیادہ مستحق ہے اور پھر اسی حقیقت کو خدا کے رسول ﷺ نے بھی کھول کھول کر بیان فرمایا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں آیا اور پوچھا: "اے خدا کے رسول ﷺ میرے نیک سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "تیری ماں" اس نے پوچھا پھر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "تیری ماں" اس نے پوچھا پھر کون ہے؟ ارشاد فرمایا: "تیری ماں" اس نے کہا پھر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "تیرا باپ" (الادب المفرد)

حضرت جاہمہؓ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ میرا ارادہ ہے کہ میں آپ ﷺ کے ساتھ جہاد میں شرکت کروں اور اسی لیے آیا ہوں کہ آپ ﷺ سے اس معاملہ میں مشورہ لوں" (فرمایئے کیا حکم ہے؟) آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: "تمہاری والدہ (زندہ) ہیں؟" جاہمہؓ نے کہا: "جی ہاں" (زندہ ہیں)۔ نب ﷺ نے ارشاد فرمایا تو پھر جاؤ اور انہی کی خدمت میں لگے رہو کیونکہ جنت انہی کے قدموں میں ہے۔" (ابن ماجہ، نسائی)

حضرت اویسؓ نبی ﷺ کے دور مین موجود تھے مگر آپ ﷺ کی ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکے۔ ان کی ایک بوڑی والدہ تھیں۔ دن رات انہی کی خدمت میں لگے رہتے۔ نبی ﷺ کے دیدار کی بڑی آرزو بھی اور کون مومن ہو گا جو اس تمنا میں نہ تڑپتا ہو کہ اس کی آنکھیں دیدارِ رسول ﷺ سے روشن ہوں۔ چنانچہ حضرت اویسؓ نے آنا بھی چاہا لیکن نبی ﷺ نے منع فرمایا۔ فریضہ حج ادا کرنے کی بھی ان کے دل میں بڑی آرزو تھی لیکن جب تک ان کی والدہ زندہ رہیں، ان کی تنہائی کے خیال سے حج نہیں کیا اور ان کی وفات کے بعد ہی یہ آرزو پوری ہو سکی۔

۱۳۔ رضاعی ماں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیجیے، اس کی خدمت کیجیے اور ادب و احترام سے پیش آیئے۔ حضرت ابو طفیلؓ کہتے ہیں میں نے جعرانہ کے مقام پر نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ گوشت تقسیم فرما رہے ہیں۔ اتنے میں ایک عورت آئیں اور نبی ﷺ کے بالکل قریب پہنچ گئیں۔ آپ ﷺ نے ان کے لیے اپنی چادر بچھا دی، وہ اس پر بیٹھ گئیں۔ میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون صاحبہ ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ نبی ﷺ کی وہ ماں ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔ (ابو داؤد)

۱۴۔ والدین کی وفات کے بعد بھی ان کا خیال رکھیے اور ان کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے لیے مندرجہ ذیل باتوں پر کاربند رہیے:

ا)۔ ماں باپ کے لیے مغفرت کی دعائین برابر کرتے رہیے۔

قرآن پاک نے مومنوں کو یہ دعا سکھائی ہے:

ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب

"پروردگار میری مغفرت فرما اور میرے والدین کی بھی اور سب ایمان والوں کو اس روز معاف فرمادے جب کہ حساب قائم ہو گا۔"

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ مرنے کے بعد جب میت کے درجات بلند ہوتے ہیں تو وہ حیرت سے پوچھتا ہے یہ کیونکر ہوا، خدا کی طرف سے اس کو بتایا جاتا ہے کہ تمہاری اولاد تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرتی رہی (اور خدا نے اس کو قبول فرمالیا)

حضرت ابوہریرہؓ ہی کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:[

"جب کوئی آدمی مر جاتا ہے تو اس کے عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے صرف تین چیزیں ایسی ہیں جو مرنے کے بعد بھی فائدہ پہنچاتی ہیں، ایک صدقہ جاریہ، دوسرے اس کا (پھیلایا ہوا وہ) علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، تیسرے وہ صالح اولاد جو اس کے لیے دعائے مغفرت کرتی رہے۔"

۲)۔والدین کے کیے ہوئے عہد وپیمان اور وصیت کو پورا کیجیے۔ماں باپ نے اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں سے کچھ وعدے کیے ہوں گے (اپنے خدا سے کچھ عہد کیا ہوگا۔کوئی نذر مانی ہوگی، کسی کو کچھ مال دینے کا وعدہ کیا ہوگا۔ان کے ذمہ کسی کا قرضہ رہ گیا ہوگا اور ادا کرنے کا موقع نہ پاسکے ہوں گے۔مرتے وقت کچھ وصیتیں کی ہوں گی)آپ اپنے امکان بھر ان سارے کاموں کو پورا کیجیے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے نبی ﷺ سے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! میری والدہ نے نذر مانی تھی ،لیکن وہ نذر پوری کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئیں کیا میں ان کی طرف سے یہ نذر پوری کر سکتا ہوں، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کیوں نہیں! تم ضرور ان کی طرف سے نذر پوری کردو۔

۳۔باپ کے دوستوں اور ماں کی سہیلیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتے رہیے۔ان کا احترام کیجیے۔ان کو اپنے مشوروں میں اپنے بزرگوں کی طرح شریک رکھیے۔ان کی رائے اور مشوروں کی تعظیم کیجیے۔ایک موقع پر نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے زیادہ نیک سلوک یہ ہے کہ آدمی اپنے والد کے دوست، احباب کے ساتھ بھلائی کرے۔

ایک بار حضرت ابوالدرداءؓ بیمار ہوئے اور مرض بڑھتا ہی گیا۔یہاں تک کہ بچنے کی کوئی امید نہ رہی، تو حضرت یوسف بن عبداللہؓ دور دراز سے سفر کر کے ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گیے۔حضرت ابوالدرداءؓ نے انہیں دیکھا تو تعجب سے پوچھا تم یہاں کہاں؟ یوسف بن عبداللہؓ نے کہا میں یہاں محض اس لیے آیا ہوں کہ آپ کی عیادت کروں کیونکہ والد بزرگوار سے آپ کے تعلقات بڑے گہرے تھے۔

حضرت ابوبردہؓ فرماتے ہیں کہ جب میں مدینے آیا تو میرے پاس عبداللہ بن عمرؓ تشریف لائے اور کہنے لگے ابو بردہ! تم جانتے ہو میں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں میں نے کہا۔میں تو نہیں جانتا کہ آپ کیوں تشریف لائے ہیں۔۔اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص قبر میں اپنے باپ کے نیک سلوک کرنا چاہتا ہو تو اس کو چاہیے کہ باپ کے مرنے کے بعد باپ کے دوست احباب کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور پھر فرمایا: بھائی میرے باپ حضرت عمرؓ اور آپ کے والد گرامی میں گہری دوستی تھی۔میں چاہتا ہوں کہ اس دوستی کو نبھاؤں اور اس کے حقوق ادا کروں۔(ابن حبان)

۴۔ماں باپ کے رشتہ داروں کے ساتھ بھی برابر نیک سلوک کرتے رہیے اور رحم کے ان رشتوں کا پوری طرح پاس ولحاظ رکھیے۔ان رشتہ داروں سے بے نیازی اور بے پروائی دراصل والدین سے بے نیازی ہے۔نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا تم اپنے آباؤ اجداد سے ہرگز بے پروائی نہ برتو، ماں باپ سے بے پروائی برتنا خدا کی ناشکری ہے۔

۵۔اگر زندگی میں خدانخواستہ ماں باپ کے ساتھ سلوک کرنے اور ان کے حقوق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہے تو پھر بھی خدا کی رحمت مایوس نہ ہو مرنے کے بعد ان کے حق میں برابر خدا سے دعائے مغفرت کرتے رہیے توقع ہے کہ خدا آپ کی کوتاہی سے درگزر فرمائے اور آپ کا شمار اپنے صالح بندوں میں فرمادے۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اگر کوئی بندہ خدا زندگی میں ماں باپ کا نافرمان رہا اور والدین میں سے کسی ایک کا یا دونوں کا اسی حال میں انتقال ہوگیا تو اب اس کو چاہیے کہ وہ اپنے والدین کے لیے برابر دعا کرتا رہے اور خدا سے ان کی بخشش کی درخواست کرتا رہے، یہاں کہ خدا اس کو اپنی رحمت سے نیک لوگوں میں لکھ دے۔

## ازدواجی زندگی کے آداب

اسلام جس اعلیٰ تہذیب و تمدن کا داعی ہے وہ اسی وقت وجود میں آسکتا ہے، جب ہم ایک پاکیزہ معاشرہ تعمیر کرنے میں کامیاب ہوں اور پاکیزہ معاشرے کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ آپ خاندانی نظام کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور کامیاب بنالیں خاندانی زندگی کا آغاز شوہر اور بیوی کے پاکیزہ ازدواجی تعلق سے ہوتا ہے۔اور اس تعلق کی خوشگواری اور استواری

اسی وقت ممکن ہے جب شوہر اور بیوی دونوں ہی ازدواجی زندگی کے آداب وفرائض سے بخوبی واقف بھی ہوں، اور اب آداب وفرائض کو بجا لانے کے لیے پوری دل سوزی، خلوص اور یکسوئی کے ساتھ سرگرم کار بھی رہیں، ذیل میں ہم پہلے

ان آداب وفرائض کو بیان کرتے ہیں جن کا تعلق شوہر سے ہے اور پھر ان آداب وفرائض کو جن کا تعلق بیوی سے ہے: (الف):

بیوی کے ساتھ اچھے سلوک کی زندگی گزاریئے۔اس کے حقوق کشادہ دلی کے ساتھ ادا کیجیے اور ہر معاملے میں احسان اور ایثار کی روش اختیار کیجیے خدا کا ارشاد ہے:

وعاشروھن بالمعروف

اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی گزارو

اور نبی ﷺ نے حجۃالوداع کے موقع پر ایک بہت بڑے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ہدایت فرمائی۔

"لوگو سنو! عورتوں کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آؤ، کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں، تمہیں ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ سوائے اس صورت کے جب ان کی طرف سے کوئی کھلی ہوئی نافرمانی سامنے آئے۔ اگر وہ ایسا کر بیٹھیں تو پھر خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو، اور انہیں مارو تو ایسا نہ مارنا کہ کوئی شدید چوٹ آئے۔ اور پھر جب وہ تمہارے کہنے پر چلنے لگیں تو ان کو خواہ مخواہ ستانے کے بہانے نہ ڈھونڈو۔ دیکھو سنو! تمہارے کچھ حقوق تمہاری بیویوں پر ہیں اور تمہاری بیویوں کے کچھ حقوق تمہارے اوپر ہیں۔ ان

پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو ان لوگوں سے نہ روندوائیں جن کو تم پر یہ ضق ہے کہ تم انہیں اچھا کھلاؤ اور اچھا پہناؤ۔"(ریاض الصالحین)

یعنی ان کے کھلانے پلانے کا ایسا انتظام کیجیے جو زوجین کی بے مثال قربت، قلبی تعلق اور جذبۂ رفاقت کے شایان شان ہو۔

۲۔ جہاں تک ہو سکے بیوی سے خوس گمان رہیے اور اس کے ساتھ نبا کرنے میں تحمل، بردباری اور دالی ظرفی کی روش اختیار کیجیے، اگر اس میں شکل وصورت، عادات واطوار یا سلیقہ اور ہنر کے اعتبار سے کوئی کمزوری ہو تو صبر کے ساتھ اس کو برداشت کیجیے اور اس کی خوبیوں پر نگاہ رکھتے ہوئے فیاضی، در گزر، ایثار اور مصلحت سے کام لیجیے، خدا کا ارشاد ہے:

والصلح خیر

"اور مصالحت خیر ہی خیر ہے۔"

اور مومنین کو ہدایت کی گئی ہے:

فان کرھتموھن فعسی ان تکرھوا شیًا و یجعل اللہ خیرا کثیرا۔(سورہ النساء۱۹)

"پھر اگر وہ تمہیں (کسی وجہ سے) ناپسند ہوں، تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر خدا نے اس میں (تمہارے لیے) بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔"

اسی مفہوم کو نبی ﷺ کے ایک حدیث میں یوں واضح فرمایا ہے:

"کوئی مومن اپنی مومنہ بیوی سے نفرت نہ کرے، اگر بیوی کی کوئی عادت اس کو ناپسند ہے تو ہو سکتا ہے کہ دوسری خصلت اس کو پسند آجائے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ہر خاتون میں کسی نہ کسی پہلو سے کوئی کمزوری ضرور ہو گی اور اگر شوہر کسی عیب کو دیکھتے ہی اس کی طرف سے نگاہیں پھیر لے اور دل برا کر لے تو پھر کسی خاندان میں گھریلو خوشگواری مل ہی نہ سکے گی۔ حکمت کی روش یہی ہے کہ آدمی در گزر سے کام لے اور خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے عورت کے ساتھ خوش دلی کے ساتھ بنا کرنے کی کوشش کرے۔ ہو سکتا ہے کہ خدا اس عورت کے واسطے سے اس مرد کو کچھ بلائیوں سے نوازے جن تک مرد کی کوتاہ نظر نہ پہنچ رہی ہو۔ مثلاً عورت میں دین وایمان اور سیرت واخلاق کی کچھ ایسی خوبیاں ہوں، جن کے باعث وہ پورے خاندان کے لیے رحمت ثابت ہو، یا اس کی ذات سے کوئی ایسی روح سعید وجود میں آئے جو ایک عالم کو فائدہ پہنچائے اور رہتی زندگی تک کے لیے باپ کے حق میں صدقہ جاریہ بنے یا عورت مرد کی اصلاح حال کا ذریعہ بنے اور اس کو جنت سے قریب کرنے میں مددگار ثابت ہو، یا پھر اس کی قسمت سے دنیا میں خدا اس مرد کو کشادہ روزی اور خوش حالی سے نوازے۔ بہر حال عورت کے کسی

ظاہری عیب کو دیکھ کر بے صبری کے ساتھ ازدواجی تعلق کو برباد نہ کیجیے بلکہ حکیمانہ طرز عمل سے دھیرے دھیرے گھر کی فضا کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانے کی کوشش کیجیے۔

۳۔عفو و کرم کی روش اختیار کیجیے اور بیوی کی کوتاہیوں، نادانیوں اور سرکشیوں سے چشم پوشی کیجیے۔عورت عقل و خرد کے اعتبار سے کمزور اور نہایت ہی جذباتی ہوتی ہے،اس لیے صبر و سکون، رحمت و شفقت اور دل سوزی کے ساتھ اس کو سدھارنے کی کوشش کیجیے اور صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے نباہ کیجیے۔

خدا کا ارشاد ہے:

یا یھا الذین آمنوا ان من ازواجکم و اولادکم فاحذروھم و ان تعفوا و تصفحوا و تغفروا فان اللہ غفور الرحیم۔(التغابن ۱۴)

"مومنو! تمہاری بعض بیویاں اور بعض اولاد تمہارے دشمن ہیں۔سو ان سے بچے رہو، اور اگر تم عفو و کرم، درگزر اور چشم پوشی سے کام لو تو یقین رکھو کہ خدا بہت ہی زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلیوں میں سب سے زیادہ اوپر کا حصہ ٹیڑھا ہے، اس کو سیدھا کرو گے تو ٹوٹ جائے گی اور اس کو چھوڑے رہو تو ٹیڑھی ہی رہے گی۔پس عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔"(بخاری، مسلم)

۴۔بیوی کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کیجیے اور پیار و محبت سے پیش آیئے نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"کامل ایمان والے مومن وہ ہیں جو اپنے اخلاق میں سب سے اچھے ہوں اور تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں سب سے اچھے ہوں۔"(ترمذی)

اپنی خوش اخلاقی اور نرم مزاجی کو جانچنے کا اصل میدان گھریلو زندگی ہے گھر والوں ہی سے ہر وقت کا واسطہ رہتا ہے اور گھر کی بے تکلف زندگی میں ہی مزاج اور اخلاق کا ہر رخ سامنے آتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ وہی مومن اپنے ایمان میں کامل ہے جو گھر والوں کے ساتھ خوش اخلاق، خندہ پیشانی اور مہربانی کا برتاؤ رکھے۔گھر والوں کی دلجوئی کرے اور پیار و محبت سے پیش آئے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نبی ﷺ کے یہاں گڑیوں سے کھلا کرتی تھی اور میری سہیلیاں بھی میرے ساتھ کھلتیں، جب نبی ﷺ تشریف لاتے تو سب ادھر ادھر چھپ جاتیں۔آپ ﷺ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک کو میرے پاس بھیجتے تا کہ میرے ساتھ کھیلیں۔"(بخاری، مسلم)

ایک بار حج کے موقع پر حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیٹھ گیا اور وہ سب سے پیچھے رہ گئی۔ نبی ﷺ نے دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہی ہیں۔ آپ ﷺ رک گئے اور اپنے دستِ مبارک سے چادر کا پلو لے کر ان کے آنسو پونچھے۔ آپ ﷺ آنسو پونچھتے جاتے تھے اور وہ بے اختیار روتی جاتی تھیں۔

۵۔ پوری فراخ دلی کے ساتھ رفیقۂ حیات کی ضرورت فراہم کیجیے اور خرچ میں کبھی تنگی نہ کیجیے۔ اپنی محنت کی کمائی گھر والوں پر صرف کر کے سکون و مسرت کیجیے۔ کھانا کپڑا بیوی کا حق ہے اور اس حق کو خوش دلی اور کشادگی کے ساتھ ادا کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنا شوہر کا انتہائی خوشگوار فریضہ ہے، اس فریضے کو کھلے دل سے انجام دینے سے نہ صرف دنیا میں خوشگوار ازدواجی زندگی کی نعمت ملتی ہے، بلکہ مومن آخرت میں بھی اجر و ثواب کا مستحق بنتا ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"ایک دینار تو وہ ہے جا تم نے خدا کی راہ میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تم نے غلام کو آزاد کرانے میں صرف کیا۔ ایک دینار وہ ہے جو تم نے کسی فقیر کو دیا اور ایک دینار وہ ہے جو تم نے اپنے گھر والوں پر صرف کیا۔ ان میں سب سے زیادہ اجر و ثواب اس دینار کے خرچ کرنے کا ہے جو تم نے اپنے گھر والوں پر صرف کیا ہے۔" (مسلم)

۶۔ بیوی کو دینی احکام اور تہذیب سکھائیے۔ دین کی تعلیم دیجیے۔ اسلامی اخلاق سے آراستہ کیجیے اور اس کی تربیت اور سدھار کے لیے، ہر ممکن کوشش کیجیے تاکہ وہ ایک اچھی بیوی، اچھی ماں اور خدا کی نیک بندی بن سکے اور اپنے منصبی فرائض کو بحسن و خوبی ادا کر سکے۔ خدا کا ارشار ہے:

یایھا الذین امنوا قوا انفسکم و اھلیکم ناراً

"ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔"

نبی ﷺ جس طرح باہر تبلیغ و تعلیم میں مصروف رہتے تھے۔ اسی طرح گھر میں بھی اس فریضے کو ادا کرتے رہتے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے نبی ﷺ کی بیویوں کو خطاب کیا ہے۔

"اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو۔"

قرآن میں نبی ﷺ کے واسطے سے مومنوں کو ہدایت کی گئی ہے۔

وامر اھلك بالصلوٰۃ و اصطبر علیھا

"اور اپنے گھر والوں کو نماز کی تاکید کیجیے اور خود بھی اس کے پورے پابند رہیے۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"جب کوئی مرد رات کو اپنی بیوی کو جگاتا ہے اور وہ دونوں مل کر دو رکعت نماز پڑھتے ہیں تو شوہر کا نام ذکر کرنے والوں میں اور بیوی کا نام ذکر کرنے والیوں میں لکھ لیا جاتا ہے۔"(ابوداؤد)

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ شب کو خدا کے حضور کھڑے عبادت کرتے رہتے پھر جب سحر کا وقت آتا تو اپنی رفیقۂ حیات کو جگاتے اور کہتے اٹھو اٹھو نماز پڑھو، اور پھر یہ آیت بھی پڑھتے:

وامر اھلك بالصلوٰة و اصطبر علیھا

۷۔ اگر کئی بیویاں ہوں تو سب کے ساتھ برابری کا سلوک کیجیے۔ نبی ﷺ بیویوں کے ساتھ برتاؤ میں برابری کا بڑا اہتمام فرماتے۔ سفر پر جاتے تو قرعہ نکالتے اور قرعہ میں جس بیوی کا نام آتا اسی کو ساتھ لے جاتے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں اور اس نے ان کے ساتھ انصاف اور برابری کا سلوک نہ کیا تو قیامت کے روز وہ شخص اس حال میں آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ گر گیا ہو گا۔"(ترمذی)

انصاف اور برابری سے مراد، معاملات اور برتاؤ میں مساوات برتنا ہے۔ رہی یہ بات کہ کسی ایک بیوی کی طرف دل کا جھکاؤ اور محبت کے جذبات زیادہ ہوں تو یہ انسان کے بس میں نہیں ہے اور اس پر خدا کے یہاں کوئی گرفت نہ ہو گی۔

۸۔ خواتین نہایت خوش دلی کے ساتھ اپنے شوہر کی اطاعت کیجیے اور اس اطاعت میں مسرت اور سکون محسوس کیجیے، اس لیے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور جو بندی خدا کے حکم کی تعمیل کرتی ہے وہ اپنے خدا کو خوش کرتی ہے۔ قرآن میں ہے:

فالصالحت قانتات

"نیک بیویاں (شوہر کی) اطاعت کرنے والی ہوتی ہیں۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"کوئی عورت شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے۔"(ابوداؤد)

شوہر کی اطاعت اور فرماں داری کی اہمیت واضح کرتے ہوئے نبی ﷺ نے عورت کو تنبیہ کی ہے:

"دو قسم کے آدمی وہ ہیں جن کی نمازیں ان کے سروں سے اونچی نہیں اٹھتیں.........اس غلام کی نماز جو اپنے آقا سے فرار ہو جائے جب تک لوٹ نہ آئے اور اس عورت کی نماز جو شوہر کی نافرمانی کرے جب تک کہ شوہر کی نافرمانی سے باز نہ آجائے۔"(الترغیب والترہیب)

۹۔اپنی آبرو اور عصمت کی حفاظت کا اہتمام کیجیے اور ان تمام باتوں اور کاموں سے بھی دور رہیے جن سے دامن عصمت پر دھبہ لگنے کا اندیشہ بھی ہو، خدا کی ہدایت کا تقاضا بھی یہی ہے اور ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنائے رکھنے کے لیے بھی یہ انتہائی ضروری ہے۔اس لیے کہ اگر شوہر کے دل میں اس طرح کا کوئی شبہ پیدا ہو جائے تو عورت کی کوئی خدمت واطاعت اور کوئی بھلائی شوہر کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتی اور اس معاملہ میں معمولی سی کوتاہی سے بھی شوہر کے دل میں شیطان شبہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔لہذا انسانی کمزوری کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انتہائی احتیاط کیجیے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"عورت جب پانچوں وقت کی نماز پڑھے، اپنی آبرو کی حفاظت کرے، اپنے شوہر کی فرمانبردار رہے تو وہ جنت میں جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔(الترغیب والترہیب)

۱۰۔شوہر کی اجازت اور مرضی کے بغیر باہر نہ جاییے اور نہ ایسے گھروں میں جاییے جہاں شوہر آپ کا جانا پسند نہ کرے اور نہ ایسے لوگوں کو اپنے گھر میں آنے کی اجازت دیجیے جن کا آنا شوہر کو ناگوار ہو۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"خدا پر ایمان رکھنے والی عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں کسی ایسے شخص کو آنے کی اجازت دے جس کا آنا شوہر کو ناگوار ہو، اور وہ گھر سے ایسی صورت میں نکلے جب کہ اس کا نکلنا شوہر کو ناگوار ہو اور عورت شوہر کے معاملے میں کسی دوسرے کا کہنا مانے۔"(الترغیب والترتیب)

یعنی شوہر کے معاملے میں شوہر کی مرضی اور اشارۂ چشم وابروہی پر عمل کیجیے اور اس کے خلاف ہر گز دوسروں کے مشورے کو نہ اپنایئے۔

۱۱۔ہمیشہ اپنے قول و عمل اور انداز واطوار سے شوہر کو خوش رکھنے کی کوشش کیجیے۔کامیاب ازدواجی زندگی کا راز بھی یہی ہے اور خدا کی رضا اور جنت کے حصول کا راستہ بھی یہی ہے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"جس عورت نے بھی اس حالت میں انتقال کیا کہ اس کا شوہر اس سے راضی اور خوش تھا تو وہ جنت میں داخل ہو گی۔"(ترمذی)

نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

"جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو جنسی ضرورت کے لیے بلائے اور وہ نہ آئے اور اس بناء پر شوہر رات بھر اس سے خفا رہے تو ایسی عورت پر صبح تک فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں۔"(بخاری، مسلم)

۱۲۔اپنے شوہر سے محبت کیجیے اور اس کی رفاقت کی قدر کیجیے۔ یہ زندگی کی زینت کا سہارا اور راہ حیات کا عظیم معین و مددگار ہے۔ خدا کی اس عظیم نعمت پر خدا کا بھی شکر ادا کیجیے اور اس نعمت کی بھی دل و جان سے قدر کیجیے۔ نبی ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

"نکاح سے بہتر کوئی چیز دو محبت کرنے والوں کے لیے نہیں پائی گئی۔"

حضرت صفیہؓ کو نبی ﷺ سے انتہائی محبت تھی۔ چنانچہ جب آپ ﷺ بیمار ہوئے تو انتہائی حسرت کے ساتھ بولیں: "کاش آپ ﷺ کے بجائے میں بیمار ہوتی۔" نبی ﷺ کی دوسری بیویوں نے اس اظہار محبت پر تعجب سے ان کی طرف دیکھا تو نبی ﷺ نے فرمایا: "دکھاوا نہیں ہے بلکہ سچ کہہ رہی ہیں۔"

۱۳۔شوہر کا احسان مانیے اس کی شکر گزار رہیے۔ آپ کا اب سے بڑا محسن آپ کا شوہر ہی تو ہے جو ہر طرح آپ کو خوش کرنے میں لگا رہتا ہے، آپ کی ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے، اور آپ کو ہر طرح کا آرام پہنچا کر آرام محسوس کرتا ہے۔

حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ ایک بار نبی ﷺ میرے پاس سے گزرے میں اپنی پڑوسن سہیلیوں کے ساتھ تھی۔ آپ ﷺ نے ہمیں سلام کیا، اور ارشاد فرمایا: "تم پر جن کا احسان ہے ان کی ناشکری سے بچو۔ تم میں سے کوئی ایک اپنے ماں باپ کے یہاں کافی دنوں تک بن بیاہی بیٹھی رہتی ہے پھر خدا اس کو شوہر عطا فرماتا ہے پھر خدا اس کو اولاد سے نوازتا ہے (ان تمام احسانات کے باوجود) اگر کبھی کسی بات پر شوہر سے خفا ہوتی ہے تو کہہ اٹھتی ہے۔ میں نے تو کبھی تمہاری طرف سے کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں۔" (الادب المفرد)

ناشکر گزار اور احسان فراموش بیوی کو تنبیہ کرتے ہوئے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خدا قیامت کے روز اس عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا، جو شوہر کی ناشکر گزار ہو گی حالانکہ عورت کسی وقت بھی شوہر سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔" (نسائی)

۱۴۔شوہر کی خدمت کر کے خوشی محسوس کیجیے اور جہاں تک ہو سکے خود تکلیف اٹھا کر شوہر کو آرام پہنچایئے اور ہر طرح اس کی خدمت کر کے اس کا دل اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کیجیے۔ حضرت عائشہؓ اپنے ہاتھ سے نبی ﷺ کے کپڑے دھوتیں، سر میں تیل لگاتیں، کنگھا کرتیں، خوشبو لگاتیں اور یہی حال دوسری صحابیہؓ خواتین کا بھی تھا۔

ایک بات نبی ﷺ نے فرمایا:

"کسی انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو سجدہ کرے۔ اگر اس کی اجازت ہوتی تو بیوی کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے، شوہر کا اپنی بیوی پر عظیم حق ہے، اتنا عظیم حق کہ اگر شوہر کا سارا جسم زخمی ہو اور بیوی شوہر کے زخمی جسم کو چاٹے تب بھی شوہر کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔" (مسند احمد)

۱۵۔شوہر کے گھر اور مال و اسباب کی حفاظت کیجیے، شادی کے بعد شوہر کے گھر ہی کو اپنا گھر سمجھیے اور شوہر کے مال کو شوہر کے گھر کی رونق بڑھانے، شوہر کی عزت بنانے اور اس کے بچوں کا مستقبل سنوارنے میں حکمت اور کفایت و سلیقے سے خرچ کیجیے، شوہر کی ترقی اور خوشحالی کو اپنی ترقی اور خوشحالی سمجھیے۔ قریش کی عورتوں کی تعریف کرتے ہوئے نبی ﷺ نے فرمایا:

"قریش کی عورتیں کیا ہی خوب عورتیں ہیں۔ بچوں پر نہایت مہربان ہیں، اور شوہر کے گھر بار کی انتہائی حفاظت کرنے والی ہیں۔" (بخاری)

اور نبی ﷺ نے نیک بیوی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"مومن کے لیے خوفِ خدا کے بعد سب سے زیادہ مفید اور باعثِ خیر نعمت نیک بیوی ہے کہ جب وہ اس سے کسی کام کو کہے تو وہ خوش دلی سے انجام دے اور جب وہ اس پر نگاہ ڈالے تو وہ اس کو خوش کر دے، اور جب وہ اس کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے، اور جب وہ کہیں چلا جائے تو وہ اس کے پیچھے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور شوہر کے مال و اسباب کی نگرانی میں شوہر کی خیر خواہ اور وفادار رہے۔ (ابن ماجہ)

۱۶۔ صفائی، سلیقہ اور آرائش و زیبائش کا بھی پورا اہتمام کیجیے۔ گھر کو بھی صاف ستھرا رکھیے اور ہر چیز کو سلیقے سے سجائیے اور سلیقے سے استعمال کیجیے، صاف ستھرا گھر، قرینے سے سجے ہوئے صاف ستھرے کمرے، گھریلو کاموں میں سلیقہ اور سگھڑ پن، بناؤ سنگھار کی ہوئی بیوی کی پاکیزہ مسکراہٹ سے نہ صرف گھریلو زندگی، پیار و محبت اور خیر و برکت سے مالا مال ہوتی ہے، بلکہ ایک بیوی کے لیے اپنی عاقبت بنانے اور خدا کو خوش کرنے کا بھی یہی ذریعہ ہے۔

ایک بار بیگم عثمان بن مظعونؓ سے حضرت عائشہؓ کی ملاقات ہوئی تو آپؓ نے دیکھا کہ بیگم عثمان نہایت سادہ کپڑوں مین ہیں اور اور کوئی بناؤ سنگھار بھی نہین کیا ہے تو حضرت عائشہؓ کو بہت تعجب ہوا اور ان سے پوچھا:

"بی بی! کیا عثمان کہیں باہر سفر پر گئے ہوئے ہیں؟"

اس تعجب سے اندازہ کیجیے کہ سہاگنوں کا اپنے شوہروں کے لیے بناؤ سنگھار کیسا پسندیدہ فعل ہے۔

ایک بار ایک صحابیہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں وہ اپنے ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھیں، آپ ﷺ نے ان کو پہننے سے منع فرمایا تو کہنے لگیں:

یا رسول اللہ ﷺ! اگر عورت شوہر کے لیے بناؤ سنگھار نہ کرے گی تو اس کی نظروں سے گر جائے گی۔ (نسائی)

## اولاد کی پرورش کے آداب

۱۔ اولاد کو خدا کا انعام سمجھیے، ان کی پیدائش پر خوشی منایئے ایک دوسرے کو مبارکباد دیجیے خیر و برکت کی دعاؤں کے ساتھ استقبال کیجیے، اور خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے آپ کو اپنے ایک بندے کی پرورش کی توفیق بخشی اور یہ موقع فراہم فرمایا کہ آپ اپنے پیچھے اپنے دین و دنیا کا جانشین چھوڑ جائیں۔

۲۔اولاد نہ ہو توخدا سے صالح اولاد کے لیے دعا کیجیے، جس طرح خدا کے برگزیدہ پیغمبر حضرت زکریا علیہ السلام نے صالح اولاد کے لیے دعا فرمائی:

"رب ھب لی من لدنك ذریۃ انك سمیع الدعاء۔(آل عمران)

"میرے رب! تو اپنے پاس سے مجھے پاک باز اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔"

۳۔اولاد کی پیدائش پر کبھی دل تنگ نہ ہوں، معاشی تنگی صحت کی خرابی یا کسی اور وجہ سے اولاد کی پیدائش پر کڑھنے یا اس کو اپنے حق میں ایک مصیبت سمجھنے سے سختی کے ساتھ پرہیز کیجیے۔

۴۔اولاد کو کبھی ضائع نہ کیجیے، پیدا ہونے سے پہلے یا پیدا ہونے کے بعد اولاد کو ضائع کرنا بدترین سنگ دلی، بھیانک ظلم، انتہائی بزدلی اور دونوں جہان کی تباہی ہے۔خدا کا ارشاد ہے:

قد خسر الذین قتلوا اولادھم سفھا بغیر علم (الانعام)

"وہ لوگ انتہائی گھاٹے میں ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو نا سمجھی میں اپنی حماقت سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

اور خدا نے انسانی کوتاہ نظری کا دل نشیں جواب دیتے ہوئے صاف صاف ممانعت فرمائی ہے کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔"

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم کان خطا کبیرا۔(بنی اسرائیل)

"اور اپنی اولاد کو فقر و فاقے کے خوف سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور ہم ہی تمھیں بھی رزق دے رہے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اولاد کا قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔"

ایک بار ایک صحابی نے دریافت کیا، یا رسول اللہ ﷺ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا۔"شرک" پوچھا اس کے بعد، فرمایا: "والدین کی نافرمانی"، پھر پوچھا اس کے بعد، فرمایا: "تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔"

۵۔ولادت کے وقت ولادت والی عورت کے پاس آیۃ الکرسی اور سورۃ الاعراف کی نیچے لکھی ہوئی دو آیتوں کی تلاوت کیجیے اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ پڑھ کر دم کیجیے۔

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۬ۚ لَا تَاۡخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوۡمٌ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ ۚ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرۡسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ

وَ الۡاَرۡضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوۡدُہٗ حِفۡظُہُمَا ۚ وَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ﴿۲۵۵﴾

"خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ زندہ و جاوید، نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے نہ وہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ آتی ہے۔ آسمانون اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور انسان اس کے علم میں سے کسی بات کا بھی احاطہ نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ جتنا علم وہ خود انسان کو دینا چاہے، اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی حفاظت و نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہین۔ وہ بڑا ہی بلند مرتبہ اور صاحب عظمت ہے۔"

سورہ اعراف کی دو آیتیں یہ ہیں:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۫ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۵۴ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝۵۵ۚ (الاعراف: ۵۴-۵۵)

"حقیقت یہ ہے کہ خدا ہی تمہارا پروردگار ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر اپنے تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوا۔ وہی رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے اور پھر دن، رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے، اسی نے سورج، چاند و تارے پیدا کیے جو اسکے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں، سن رکھو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کا حق ہے حکم دینا۔ پس کیا ہی برکت والا ہے خدا سارے جہانوں کا مالک اور پروردگار، اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، بے شک وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

۶۔ ولادت کے بعد نہلا دھلا کر دائیں کان میں آذان اور بائیں کان میں اقامت کہیے جب حضرت حسینؓ کی ولادت ہوئی تو نبی ﷺ نے ان کے کان میں آذان و اقامت فرمائی۔ (طبرانی)

اور نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جس کے یہاں بچے کی ولادت ہو اور وہ اس بچے کے دائیں کان میں آذان اور بائیں کان میں اقامت کہے تو بچہ ام الصبیان! کی تکلیف سے محفوظ رہے گا۔ (ابو یعلی ابن سنی)

پیدا ہوتے ہی بچے کے کان میں خدا اور رسول ﷺ کا نام پہنچانے میں بڑی حکمت ہے، علامہ ابن قیم اپنی کتاب "تحفۃ الودود" میں فرماتے ہیں:

"اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے کان میں سب سے پہلے اللہ تعالی کی عظمت اور کبریائی کی آواز پہنچے اور جس شہادت کو وہ شعوری طور پر ادا کرنے کے بعد داخل اسلام ہو گا اس کی تلقین پیدائش کے دن ہی سے کی جائے۔ جس طرح مرنے کے وقت اس کو کلمۂ توحید کی تلقین کی جاتی ہے، آذان اور اقامت کا دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ شیطان جو گھات میں بیٹھا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ پیدا ہوتے ہی انسان کو آزمائش میں مبتلا کرے آذان سنتے ہی بھاگ جاتا ہے اور شیطان کی دعوت سے پہلے بچے کو اسلام اور عبادت الٰہی کی دعوت دے دی جاتی ہے۔

۷۔آذان واقامت کے بعد کسی نیک مرد یا عورت سے کھجور چبوا کر بچے کے تالو میں لگوایئے اور بچے کے لیے خیر و برکت کی دعا کرایئے۔
حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ عبداللہ بن زبیرؓ جب پیدا ہوئے تو میں نے ان کو نبی ﷺ کی گود میں دیا۔آپ ﷺ نے خرما منگوایا اور چبا کر لعاب مبارک عبداللہ بن زبیرؓ کے منہ میں لگا دیا اور خرما ان کے تالو میں ملا اور خیر و برکت کی دعا فرمائی۔

۱ مرگی جو بچوں کو فاسد ہوا لگنے سے ہو جاتی ہے اور بچے اس مرض میں بے ہوش ہو جاتے ہیں

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ کے یہاں بچے لائے جاتے تھے۔آپ ﷺ تحنیک[۱] فرماتے اور ان کے حق میں دعا کرتے۔"(مسلم)

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی تو آپ نے اس کی تحنیک کے لیے مکے کی کھجور منگوائی جو آپ کے گھر میں موجود تھی اور ایک نیک بی بی ام علیؒ سے تحنیک کے لیے درخواست کی۔

۸۔بچے کے لیے اچھا سا نام تجویز کیجیے جو یا تو پیغمبروں کے نام پر ہو یا خدا کے نام سے پہلے عبد لگا کر ترکیب دیا گیا ہو جیسے عبداللہ،عبدالرحمن وغیرہ۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:"قیامت کے روز تمہیں اپنے اپنے ناموں سے پکارا جائے گا،اس لیے بہتر نام رکھا کرو۔"(ابو دؤود)

اور نبی ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ خدا کو تمہارے ناموں میں سے عبداللہ اور عبدالرحمن سب سے زیادہ پسند ہیں اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ انبیاء کے ناموں پر نام رکھو۔

اور بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"میرے نام پر نام رکھو میری کنیت پر مت رکھو۔"

۹۔اگر کبھی لاعلمی میں غلط نام رکھ دیا ہو تو اس کو بدل کر اچھا نام رکھ دیجیے۔نبی ﷺ غلط نام کو بدل دیا کرتے تھے،حضرت عمرؓ کی ایک صاحبزادی کا نام عاصیہ تھا۔آپ ﷺ نے بدل کر جمیلہ رکھ دیا۔(مسلم)

حضرت زینب،ابو سلمہؓ کی بیٹی ہیں،ان کا نام برہ تھا،برہ کے معنی ہیں پاکباز،نبی ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا خود ہی اپنی پاکبازی کا دم بھرتی ہو،لوگوں نے کہا پھر کیا نام رکھیں؟آپ ﷺ نے فرمایا:'زینب نام رکھو۔"(ابوداؤد)

۱۰۔ساتویں دن عقیقہ کیجیے۔لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا کیجیے۔لیکن لڑکے کی طرف سے دو بکرے کرنا ضروری نہیں ہے۔ایک بکرا بھی کر سکتے ہیں اور بچے کے بال منڑوا کر اس کے برابر سونا یا چاندی خیرات کیجیے۔نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

ساتویں روز بچے کا نام تجویز کیا جائے اور اس کے بال اتروا کر اس کی طرف سے عقیقہ کیا جائے۔"(ترمذی)

۱۱۔ساتویں دن ختنہ بھی کرا دیجیے،لیکن کسی وجہ سے نہ کرائیں تو سات سال کی عمر کے اندر اندر ضرور کرا دیں،ختنہ اسلامی شعار ہے۔

۱۲۔جب بچہ بولنے لگے تو سب سے پہلے اسے کلمہ "لاالہ الااللہ" سکھایئے۔نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔

"جب تمہاری اولاد بولنے لگے تو اس کو "لاالہ الااللہ" سکھادو، پھر مت پرواکرو کہ کب مرے اور جب دودھ کے دانت گر جائیں تو نماز کا حکم دو۔"(نسائی)

اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کے خاندان میں جب کسی بچے کی زبان کھل جاتی تو آپ ﷺ اس کو سورۃ الفرقان کی دوسری آیت سکھاتے، جس میں توحید کی پوری تعلیم کو بری خوبی کے ساتھ سمیٹ دیا گیا ہے۔

الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَمۡ يَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ شَرِيۡكٌ فِى الۡمُلۡكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا ۝۲

"وہ خدا جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک

[1] کھجور وغیرہ کو چبا کر خوب نرم کر کے بچے کے تالو میں لگانے کو تحنیک کہتے ہیں۔

نہیں ہے، جس نے ہر چیز کی تخلیق کی اور پھر اس کی موزوں تقدیر مقرر فرمائی۔"

۱۳۔بچے کو اپنا دودھ بھی پلایئے، ماں پر بچے کا یہ حق ہے، قرآن نے اولاد کو ماں کا یہی احسان یاد دلا کر ماں کے ساتھ غیر معمولی سلوک کی تاکید کی ہے۔ماں کا فرض یہ ہے کہ وہ بچے کو اپنے دودھ کے ایک ایک قطرے کے ساتھ توحید کا درس، رسول ﷺ کا عشق اور دین کی محبت بھی پلائے اور اس محبت کو اس کے قلب وروح میں بسانے کی کوشش کرے۔پرورش کرے۔پرورش کی ذمہ داری بابا پر ڈال کر اپنا بوجھ ہلکا نہ کیجیے بلکہ اس خوشگوار دینی فریضے کو انجام دے کر روحانی سکون اور سرور محسوس کیجیے۔

۱۴۔بچوں کو ڈرانے سے پرہیز کیجیے۔ابتدائی عمر کا یہ ڈر ساری عمر ذہن ودماغ پر چھایا رہتا ہے اور ایسے بچے بالعموم زندگی میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کے لائق نہیں رہتے۔

۱۵۔اولاد کو بات بات پر ڈانٹنے، جھڑکنے اور برا بھلا کہنے سے سختی کے ساتھ پرہیز کیجیے اور ان کی کوتاہیوں پر بیزار ہونے اور نفرت کا اظہار کرنے کی بجائے حکمت وسوز کے ساتھ ان کی تربیت کرنے کی محبت آمیز کوشش کیجیے اور اپنے طرز عمل سے بچوں کے ذہن پر یہ خوف بہر حال غالب رکھیے کہ ان کی کوئی خلاف شرع بات آپ ہر گز برداشت نہ کریں گے۔

۱۶۔اولاد کے ساتھ ہمیشہ، شفقت، محبت، نرمی کا برتاؤ کیجیے اور حسب ضرورت وحیثیت ان کی ضروریات پوری کر کے ان کو خوش رکھیے اور اطاعت وفرمانبرداری کے جذبات ابھاریئے۔

ایک بار حضرت امیر معاویہؓ نے احنف بن قیسؒ سے پوچھا، کہیے اولاد کے سلسلے میں کیا سلوک ہونا چاہیے۔احنیف بن قیسؒ نے کہا:

"امیر المومنین! اولاد ہمارے قلوب کا ثمرہ ہیں، کمر کی ٹیک ہیں، ہماری حیثیت ان کے لیے زمین کی طرح ہے جو نہایت نرم اور بے ضرر ہے اور ہمارا وجود ان کے لیے سایہ فگن آسمان کی طرح ہے اور ہم انہی کے ذریعہ بڑے بڑے کام انجام دینے کی ہمت کرتے ہیں۔ پس اگر وہ آپ سے کچھ مطالبہ کریں تو ان کو خوب دیجیے اور اگر کبھی گرفتہ دل ہوں تو ان کے دلوں کا غم دور کیجیے۔ نتیجہ میں وہ آپ سے محبت کریں گے، آپ کی پدرانہ کوششوں کو پسند کریں گے اور کبھی ان پر ناقابل برداشت بوجھ نہ بنیے کہ وہ آپ کی زندگی سے اکتا جائیں اور آپ کی موت کے خواہاں ہوں، آپ کے قریب آنے سے نفرت کریں۔"

حضرت امیر معاویہؓ، یہ حکیمانہ باتیں سن کر بہت متاثر ہوئے اور فرمایا:

"احنیف! خدا کی قسم جس وقت آپ میرے پاس آکر بیٹھے، میں یزید کے خلاف غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔"

پھر جب حضرت احنیف تشریف لے گئے تو حضرت امیر معاویہؓ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور یزید سے راضی ہو گئے اور اسی وقت یزید کو دوسو درہم اور دوسو جوڑے بھجوائے۔ یزید کے پاس جب یہ تحفے پہنچے تو یزید نے یہ تحفے دو برابر برابر حصوں میں تقسیم کر کے سو درہم اور سو جوڑے حضرت احنیف بن قیسؓ کی خدمت میں بھجوا دیے۔

۱۷۔ چھوٹے بچوں پر شفقت کا ہاتھ پھیریئے۔ بچوں کو گود میں لیجیے، پیار کیجیے اور ان کے ساتھ خوش طبعی کا سلوک کیجیے۔ ہر وقت تند خو اور سخت گیر حاکم نہ بنے رہیے، اس طرز عمل سے بچوں کے دل میں والدین کے لیے والہانہ جذبۂ محبت بھی پیدا نہیں ہوتا، ان کے اندر خود اعتمادی بھی نہیں پیدا ہوتی اور ان کی فطری نشوونما پر بھی خوشگوار اثر نہیں پڑتا۔

ایک مرتبہ اقرع بن حابسؓ نبی ﷺ کے پاس آئے۔ حضور ﷺ اس وقت حضرت حسنؓ کو پیار کر رہے تھے اقرع کو دیکھ کر تعجب ہوا اور بولے یا رسول اللہ ﷺ! آپ بھی بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے تو دس بچے ہیں لیکن میں نے تو کبھی کسی ایک کو بھی پیار نہیں کیا............ نبی ﷺ نے اقرع کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا اگر خدا نے تمہارے دل سے رحمت و شفقت کو نکال دیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟

فاروق اعظمؓ کے دور میں حضرت عامرؓ کسی اہم عہدے پر تھے، ایک بار حضرت عمرؓ سے ملنے کے لیے ان کے گھر پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ لیٹے ہوئے ہیں اور بچے سینے پر چڑھے ہوئے کھیل رہے ہیں.......................... حضرت عامر کو یہ بات کچھ گراں گزری۔ امیر المومنین نے پیشانی کے اتار چڑھاؤ سے ان کی ناگواری کو بھانپ لیا اور حضرت عامرؓ سے بولے: کہیے! آپ کا اپنے بچوں کے ساتھ کیسا برتاؤ رہتا ہے؟

عامرؓ کو موقع مل گیا، بولے امیر المومنین! جب میں گھر میں داخل ہوتا ہوں تو گھر والوں پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ دم سادھ کر چپ ہو جاتے ہیں، حضرت عمرؓ نے بڑے سوز کے ساتھ کہا۔

"عامرؓ! آپ امت محمدیہ ﷺ کے فرزند ہو کر یہ نہیں جانتے کہ مسلمان کو اپنے گھر والوں کے ساتھ کس طرح نرمی اور محبت کا سلوک کرنا چاہیے۔"

۱۸۔اولاد کو پاکیزہ تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے کے لیے اپنی کوشش وقف کر دیجیے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کیجیے۔یہ آپ کی دینی ذمہ داری بھی ہے،اولاد کے ساتھ عظیم احسان بھی اور اپنی ذات کے ساتھ سب سے بڑی بھلائی بھی۔قرآن میں ہے:

یا یھا الذین امنوا قوا انفسکم و اھلیکم ناراً۔

"مومنو!بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے۔"

اور جہنم کی آگ سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ آدمی دین کے ضروری علم سے بہرہ مند ہو اور اس کی زندگی خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری میں گزر رہی ہو۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:"باپ اپنی اولاد کو جو کچھ دے سکتا ہے اس میں سب سے بہتر عطیہ اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت ہے۔"(مشکوٰۃ)

اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر تین قسم کے اعمال ایسے ہیں کہ ان کا اجر و ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ایک یہ کہ وہ صدقہ جاریہ کر جائے،دوسرے یہ کہ وہ ایسا علم چھوڑ جائے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں،تیسرے صالح اولاد جو باپ کے لیے دعا کرتی رہے۔"(مسلم)

دراصل اولاد ہی آپ کی تہذیبی روایات،دینی تعلیمات اور پیغام توحید کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہے اور مومن نیک اولاد کی آرزوئیں اسی لیے کرتا ہے تاکہ وہ اس کے بعد اس کے پیغام کو زندہ رکھ سکے۔

۱۹۔بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز سکھایئے،نماز پڑھنے کی تلقین کیجیے اور اپنے ساتھ مسجد لے جا کر شوق پیدا کیجیے اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں اور نماز میں کوتاہی کریں تو انہیں مناسب سزا بھی دیجیے قول و عمل سے ان پر واضح کر دیجیے کہ نماز کی کوتاہی کو آپ برداشت نہ کریں گے۔

۲۰۔بچے جب دس سال کے ہو جائیں تو ان کے بستر الگ کر دیجیے اور ہر ایک کو الگ الگ چار پائی پر سلایئے۔نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"اپنی اولاد کو نماز پڑھنے کی تلقین کرو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور نماز کے لیے ان کو سزا دو جب وہ دس سال کے ہو جائیں،اور اس عمر کو پہنچنے کے بعد ان کے بستر الگ کر دو۔"

۲۱۔بچوں کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھیے۔ان کی طہارت،نظافت اور غسل وغیرہ کا خیال رکھیے،کپڑے بھی پاک صاف رکھیے،البتہ زیادہ بناؤ سنگھار اور نمود و نمائش سے پرہیز کیجیے۔لڑکی کے کپڑے بھی نہایت سادہ رکھیے اور زرق برق لباس پہنا کر بچوں کے مزاج خراب نہ کیجیے۔

۲۲۔ دوسروں کے سامنے بچوں کے عیب نہ بیان کیجیے اور کسی کے سامنے ان کو شرمندہ کرنے اور ان کی عزت نفس کو ٹھیس لگانے سے بھی سختی کے ساتھ پرہیز کیجیے۔

۲۳۔ بچوں کے سامنے کبھی بچوں کی اصلاح سے مایوسی کا اظہار نہ کیجیے، بلکہ ان کی ہمت بڑھانے کے لیے ان کی معمولی اچھائیوں کی بھی دل کھول کر تعریف کیجیے۔ ہمیشہ ان کا دل بڑھانے اور ان میں خود اعتمادی اور حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کیجیے تاکہ یہ کارگاہ حیات میں اونچے سے اونچا مقام حاصل کر سکیں۔

۲۴۔ بچوں کو نبیوں کے قصے، صالحین کی کہانیاں اور صحابہ کرامؓ کے مجاہدانہ کارنامے ضرور سناتے رہیں۔ تربیت و تہذیب، کردار سازی اور دین سے شغف کے لیے اس کو انتہائی ضروری سمجھیے۔ اور ہزار مصروفیتوں کے باوجود اس کے لیے وقت نکالیے اکثر و بیشتر ان کو قرآن پاک بھی خوش الحانی کے ساتھ پڑھ کر سنایئے اور موقع موقع سے نبی ﷺ کی پر اثر باتیں بھی بتایئے اور ابتدائی عمر ہی سے ان کے دلوں میں عشق رسول ﷺ کی تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کیجیے۔

۲۵۔ کبھی کبھی بچوں کے ہاتھ سے غریبوں کو کچھ کھانا یا پیسے وغیرہ بھی دلوایئے تاکہ ان میں غریبوں کے ساتھ سلوک اور سخاوت و خیرات کا جذبہ پیدا ہو اور کبھی کبھی یہ موقع بھی فراہم کیجیے کہ کھانے پینے کی چیزیں بہن بھائیوں میں خود ہی تقسیم کریں، تاکہ ایک دوسرے کے حقوق کا احساس اور انصاف کی عادت پیدا ہو۔

۲۶۔ بچوں کی ہر جا و بے جا ضد پوری نہ کیجیے، بلکہ حکمت کے ساتھ ان کی یہ عادت چھڑانے کی کوشش کیجیے، کبھی کبھی مناسب سختی بھی کیجیے، بے جا لاڈ پیار سے ان کو ضدی اور خود سر نہ بنایئے۔

۲۷۔ کرخت آواز سے بولنے اور گلا پھاڑ کر چیخنے چلانے سے خود بھی پرہیز کیجیے اور ان کو بھی تاکید کیجیے کہ درمیانی آواز میں نرمی کے ساتھ گفتگو کریں اور آپس میں بھی ایک دوسرے پر چیخنے چلانے سے سختی کے ساتھ بچیں۔

۲۸۔ بچوں کو عادت ڈالیے کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کریں، ہر کام میں نوکروں کا سہارا نہ لیں۔ اس سے بچے کاہل سست اور اپاہج بن جاتے ہیں بچوں کو جفاکش، محنتی اور سخت کوش بنایئے۔

۲۹۔ بچوں میں باہم لڑائی ہو جائے تو اپنے بچے کی بے جا حمایت نہ کیجیے۔ یہ خیال رکھیے کہ اپنے بچے کے لیے آپ کے سینے میں جو جذبات ہیں وہی جذبات دوسروں کے سینے میں اپنے بچوں کے لیے ہیں، آپ ہمیشہ اپنے بچے کے قصوروں پر نگاہ رکھیے اور ہر پیش آنے والے ناخوشگوار واقعہ میں اپنے بچے کی کوتاہی اور غلطی کی کھوج لگا کر حکمت اور مسلسل توجہ سے اس کو دور کرنے کی پرزور کوشش کیجیے۔

۳۰۔ اولاد کے ساتھ ہمیشہ برابری کا سلوک کیجیے اور اس معاملے میں بے اعتدالی سے بچنے کی پوری پوری کوشش کیجیے۔ اگر طبعاً کسی ایک بچے کی طرف زیادہ میلان ہو تو معذوری ہے، لیکن سلوک و برتاؤ اور لین دین میں ہمیشہ انصاف کا لحاظ رکھیے اور کبھی کبھی کسی ایک کے ساتھ ایسا

امتیازی سلوک نہ کیجیے جس کو دوسرے بچے محسوس کریں۔اس سے دوسرے بچوں میں احساس کمتری، نفرت، مایوسی اور آخر کار بغاوت پیدا ہو گی اور یہ برے جذبات فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے میں زبردست رکاوٹ اور اخلاق اور روحانی ترقی کے لیے سم قاتل ہیں۔

ایک بار حضرت نعمانؓ کے والد حضرت بشیرؓ اپنے بیٹے کو ساتھ لیے حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یارسول اللہﷺ! میرے پاس ایک غلام تھا، وہ میں نے اپنے اس لڑکے کو بخش دیا۔ نبیﷺ نے پوچھا کیا تم نے اپنے ہر لڑکے کو ایک ایک غلام بخشا ہے؟ بشیرؓ بولے: نہیں۔ تو حضورﷺ نے فرمایا کہ اس غلام کو تم واپس لے لو اور فرمایا خدا سے ڈرو اور اپنی اولاد کے ساتھ مساوات اور برابری کا سلوک کرو، اب حضرت بشیرؓ گھر واپس آئے اور نعمان سے اپنا دیا ہوا غلام واپس لے لیا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ آپﷺ نے فرمایا:

"تو پھر مجھے گناہ پر گواہ نہ بناؤ، میں ظلم کا گواہ نہ بنوں گا۔"

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضورﷺ نے پوچھا کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ سب لڑکے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ حضرت بشیرؓ نے کہا: یارسول اللہﷺ کیوں نہیں۔ نبیﷺ نے فرمایا: "پھر ایسا کام مت کرو۔" (بخاری، مسلم)

۳۱۔ بچوں کے سامنے ہمیشہ اچھا عملی نمونہ پیش کیجیے۔ آپ کی زندگی بچوں کے لیے ایک ہمہ وقتی خاموش معلم ہے جس سے بچے ہر وقت پڑھتے اور سیکھتے رہتے ہیں بچوں کے سامنے کبھی مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولیے۔

حضرت عبداللہ بن عامرؓ اپنا ایک قصہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضورﷺ ہمارے گھر تشریف رکھتے تھے۔ میری والدہ نے مجھے بلایا اور کہا: "یہاں آ! میں تجھے چیز دوں گی۔ حضورﷺ نے دیکھ لیا پوچھا: "تم بچے کو کیا دینا چاہتی ہو؟ والدہ بولیں: "مین اس کو کھجور دینا چاہتی ہوں۔" آپﷺ نے والدہ سے فرمایا: "اگر تم دینے کا بہانہ کر کے بلاتیں اور بچے کے آنے پر کچھ نہ دیتیں تو تمہارے اعمال نامہ میں جھوٹ لکھ دیا جاتا۔" (ابوداؤد)

۳۲۔ لڑکی کی پیدائش پر بھی اسی طرح خوشی منائیے جس طرح لڑکے کی پیدائش پر مناتے ہیں، لڑکی ہو یا لڑکا دونوں ہی خدا کا عطیہ ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ کے حق میں لڑکی اچھی ہے یا لڑکا۔ لڑکی کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھانا اور دل شکستہ ہونا اطاعت شعار مومن کے لیے کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ یہ ناشکری بھی ہے اور خدائے علیم و کریم کی توہین بھی۔

حدیث میں ہے کہ "جب کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو خدا اس کے ہاں فرشتے بھیجتا ہے جو آکر کہتے ہیں، اے گھر والو! تم پر سلامتی ہو، وہ لڑکی کو اپنے پروں کے سائے میں لے لیتے ہیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ہیں: "یہ کمزور جان ہے جو کمزور جان سے پیدا ہوئی ہے جو اس بچی کی نگرانی اور پرورش کرے گا قیامت تک خدا کی مدد اس کے شامل حال رہے گی۔" (طبرانی)

۳۳۔ لڑکیوں کی تربیت و پرورش انتہائی خوش دلی، روحانی مسرت اور دینی احساس کے ساتھ کیجیے اور اس کے صلے میں خدا سے بہشت بریں کی آرزو کیجیے۔ نبیﷺ کا ارشاد ہے: "جس شخص نے تین لڑکیوں یا تین بہنوں کی سرپرستی کی انہیں تعلیم و تہذیب سکھائی اور ان کے ساتھ رحم کا سلوک کیا۔ یہں تک کہ خدا ان کو بے نیاز کر دے تو ایسے شخص کے لیے خدا نے جنت واجب فرما دی اس پر ایک آدمی بولا، اگر عو

ہی ہوں تو نبی ﷺ نے فرمایا۔ دو لڑکیوں کی پرورش کا بھی یہی صلہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ ایک کے بارے میں پوچھتے تو آپ ﷺ ایک کی پرورش پر بھی یہی بشارت دیتے۔"(مشکوٰۃ)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک دن ایک عورت اپنی دو بچیوں کے لیے میرے پاس آئی اور اس نے کچھ مانگا۔ میرے پاس صرف ایک ہی کھجور تھی، وہ میں نے اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور آدھی آدھی دونوں بچیوں میں بانٹ دی اور خود نہ کھائی اس کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔ اسی وقت نبی ﷺ گھر تشریف لائے میں نے آپ ﷺ کو یہ سارا ماجرا کہہ سنایا، آپ ﷺ نے سن کر فرمایا: "جو شخص بھی بچیوں کی پرورش کے ذریعے آزمایا جائے اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کر کے آزمائش میں کامیاب ہو تو یہ لڑکیاں اس کے لیے قیامت کے روز جہنم کی آگ سے ڈھال بن جائیں گی۔"(مشکوٰۃ)

۳۴۔ لڑکی کو حقیر نہ جانیے، نہ لڑکے کو اس پر کسی معاملے میں ترجیح دیجیے دونوں کے ساتھ یکساں محبت کا اظہار کیجیے اور یکساں سلوک کیجیے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "جس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اس نے جاہلیت کے طریقے پر اسے زندہ دفن نہیں کیا اور نہ اس کو حقیر جانا اور نہ لڑکے کو اس کے مقابلے میں ترجیح دی اور زیادہ سمجھا تو ایسے آدمی کو خدا جنت میں داخل کرے گا۔"(ابوداؤد)

۳۵۔ جائیداد میں لڑکی کا مقررہ حصہ پوری خوش دلی اور اہتمام کے ساتھ دیجیے۔ یہ خدا کا فرض کردہ حصہ ہے اس میں کمی پیشی کرنے کا کسی کو کوئی اختیار نہیں، لڑکی کا حصہ دینے میں حیلے کرنا یا اپنی صواب دید کے مطابق کچھ دے دلا کر مطمئن ہو جانا اطاعت شعار مومن کا کام نہیں ہے۔ ایسا کرنا خیانت بھی ہے اور خدا کے دین کی توہین بھی۔

۳۶۔ ان تمام عملی تدبیروں کے ساتھ ساتھ نہایت سوز اور دل کی لگن کے ساتھ اولاد کے حق میں دعا بھی کرتے رہیے۔ خدائے رحمٰن و رحیم سے توقع ہے کہ وہ والدین کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی پرسوز دعائیں ضائع نہ فرمائے گا۔

## دوستی کے آداب

۱۔ دوستوں سے محبت کیجیے اور دوستوں کے لیے مرکز محبت بنیے۔ وہ شخص انتہائی خوش نصیب ہے جس کو اس کے دوست احباب عزیز رکھتے ہوں اور وہ دوست احباب کو عزیز رکھتا ہو اور وہ شخص انتہائی محروم ہے جس سے لوگ بیزار رہتے ہوں اور وہ لوگوں سے دور بھاگتا ہو۔ مفلس وہ نہیں ہے جس کے پاس دولت نہ ہو بلکہ حقیقت میں سب سے مفلس وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو، دوست زندگی کی زینت، سفر حیات کا سہارا، اور خدا کا انعام ہے۔ دوست بنائیے اور دوست بنیے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"مومن سراپا الفت و محبت ہے اور اس آدمی میں سرے سے کوئی خیر نہیں ہے جو نہ تو دوسروں سے محبت کرے اور نہ دوسرے ہی اس سے محبت کریں۔(مشکوٰۃ باب الشفقۃ)

قرآن پاک میں ہے:

والمومنون و المومنات بعضهم اولیاء بعض (التوبہ)

"مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں۔"

نبی ﷺ اپنے ساتھیوں سے انتہائی محبت فرماتے تھے اور ہر ایک یہ محسوس کرتا کہ نبی ﷺ سب سے زیادہ اسی کو چاہتے ہیں۔

حضرت عمروؓ بن العاص کہتے ہیں کہ نبی ﷺ اس توجہ اور خلوص کے ساتھ مجھ سے گفتگو فرماتے اور اتنا خیال رکھتے کہ مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ شاید میں اپنی قوم کا سب سے بہتر آدمی ہوں اور ایک دن نبی ﷺ سے پوچھ بیٹھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں افضل ہوں یا ابو بکرؓ؟ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ابو بکر افضل ہیں۔" پھر میں نے پوچھا: "میں افضل ہوں یا عمرؓ؟ فرمایا: "عمرؓ۔" میں نے پھر پوچھا یا رسول اللہ ﷺ میں افضل ہوں یا عثمانؓ؟ ارشاد فرمایا: "عثمان۔" پھر میں نے نبی ﷺ سے بڑی وضاحت کے ساتھ حقیقت معلوم کی اور آپ ﷺ نے بلا رو ورعایت صاف صاف بات کہہ دی تب تو مجھے اپنی اس حرکت پر بڑی ہی شرم آئی اور میں دل میں خیال کرنے لگا کہ بھلا ایسی بات پوچھنے کی مجھے کیا ضرورت تھی۔

۲۔ دوستوں کے ساتھ مل جل کر میل محبت کی زندگی گزاریئے اور مخلصانہ تعلقات قائم کرنے اور قائم رکھنے کی کوشش کیجیے۔ دوستوں سے نفرت، بیزاری اور لیے دیے رہنے کی روش چھوڑیئے۔ جب آدمی دوستوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ہر معاملہ میں ان کا شریک رہتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچتی ہیں، کبھی اس کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے، کبھی اس کے وقار کو صدمہ پہنچتا ہے، کبھی اس کے آرام میں خلل پڑتا ہے، کبھی اس کے معمولات متاثر ہوتے ہیں، کبھی اس کی خواہش اور رجحان کے خلاف کچھ باتیں سامنے آتی ہیں، کبھی اس کے صبر و برداشت کی آزمائش ہوتی ہے، کبھی اس کو مالی نقصان پہنچتا ہے۔ غرض مختلف قسم کی اذیتیں اور تکلیفیں اس کو پہنچتی ہیں لیکن جب یہ شخص ان ازیتوں کو برداشت کرتا ہے تو اس کے قلب میں اس سے جلا پیدا ہوتا ہے اچھے اخلاق نشو و نما پاتے ہیں اور وہ تربیت و تزکیے کے فطری منازل سے گزرتا ہوا روحانی اور اخلاقی ترقی کرتا ہے اس میں تحمل و بردباری، ایثار و شفقت، ہمدردی و غمگساری، مروت و وفاداری، خیر خواہی و تعاون، خلوص و محبت، سخاوت و شجاعت، اور مرحمت و مواساۃ کے اعلیٰ ترین جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ انسانی معاشرے کے لیے سراپا خیر و برکت بن جاتا ہے۔ ہر دل میں اس کے لیے قدر و عظمت کے جذبات ہوتے ہیں اور ہر انسان اس کے وجود کو اپنے حق میں رحمت کا سایہ و مجھتا ہے، نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"جو مسلمان لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے وہ کہیں بہتر ہے اس شخص سے جو لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہے، اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں پر برداشتہ خاطر ہوتا ہے۔" (ترمذی)

۳۔ ہمیشہ نیک و صالح لوگوں سے دوستی کیجیے، دوستی کے انتخاب میں اس بات کا ضرور لحاظ رکھیے کہ جن لوگوں سے آپ قلبی تعلق بڑھا رہے ہیں وہ دین و اخلاق کے پہلو سے آپ کے لیے کس حد تک مفید ہو سکتے ہیں۔ ایک مشہور مثل ہے کہ "اگر کسی کی اخلاقی حالت معلوم کرنا چاہو تو اس کے دوستوں کی اخلاقی حالت معلوم کرو۔" اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لیے ہر آدمی کو غور کر لینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔" (مسند احمد، مشکوٰۃ)

دوسرکے دین پر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ دوست کی صحبت میں بیٹھے گا تو وہی جذبات وخیالات اور وہی ذوق ورجان اس میں بھی پیدا ہو گا جو دوست میں ہے اور پسند و ناپسند کا وہی معیار اس کا بھی بنے گا جو اس کے دوست کا ہے اس لیے آدمی کو دوست کے انتخاب میں انتہائی غور و فکر سے کام لینا چاہیے اور قلبی لگاؤ اسی سے بڑھانا چاہیے جس کا ذوق ورجحان، افکار و خیالات اور دوڑ دھوپ دین وایمان کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ نبی ﷺ نے تاکید فرمائی کہ مومن ہی سے رشتۂ محبت استوار کرو اور اسی کے ساتھ اپنا کھانا پینا رکھو، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"مومن ہی کی صحبت میں رہو اور تمہارے دستر خوان پر پرہیزگار ہی کھانا کھائے۔"

ایک دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا پینا قلبی تعلق اور محبت کا فطری محرک ہے اور یہ تعلق و محبت اسی مومن سے ہونا چاہیے جو متقی اور پرہیزگار ہو۔ خدا سے غافل، غیر ذمہ دار، بے عمل، اور بداخلاق لوگوں سے ہمیشہ دور رہیے۔ نبی ﷺ نے اچھے اور برے دوست سے تعلق کی کیفیت کو ایک بلیغ تمثیل میں یوں بیان فرمایا ہے:

"اچھے اور بے دوست کی مثال مشک بیچنے والے اور بھٹی دھونکنے والے لوہار کی طرح ہے۔ مشک بیچنے والے کی صحبت سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا یا مشک خریدو گے یا مشک کی خوشبو پاؤ گے۔ لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑے جلائے گی یا تمہارے دماغ میں اس کی بدبو پہنچے گی۔" (بخاری، مسلم)

اور ابوداؤد میں حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

"نیک دوست کی مثال ایسی ہے جیسے مشک بیچنے والے کی دکان کہ اگر کچھ فائدہ نہ بھی ہو تو خوشبو تو ضرور آئے گی اور برا دوست ایسا ہے جیسے بھٹی سے آگ نہ لگے تب بھی دھوئیں سے کپڑے تو ضرور کالے ہوں گے۔"

۴۔ دوستوں سے صرف خدا کے لیے محبت کیجیے، خدا کے محبوب بندے وہی ہیں، جو خدا کے دین کی بنیاد پر باہم جڑے ہیں اور کندھے سے کندھا اور دل سے دل ملا کر اس طرح خدا کے دین کی اقامت اور حفاظت کا فریضہ انجام دیتے ہیں کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار معلوم ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ

"حقیقت میں خدا کے محبوب وہ لوگ ہیں جو خدا کی راہ میں اس طرح پیر جما کر لڑتے ہیں گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔"

اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"قیامت میں خدا فرمائے گا، وہ لوگ کہاں ہیں جو صرف میرے لیے لوگوں سے محبت کیا کرتے تھے۔آج میں ان کو اپنے سایے میں جگہ دوں گا۔"(مسلم)

اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو جو قابل رشک شان وشوکت حاصل ہو گی اس کا ذکر کرتے ہوئے نبی ﷺ نے فرمایا:

"خدا کے بندوں میں کچھ (ایسے سعادت مند) ہیں جو نبی اور شہید تو نہیں ہیں لیکن قیامت کے روز خدا ان کو ایسے مرتبوں پر سرفراز فرمائے گا کہ انبیاء اور شہید بھی ان کے رتبوں پر رشک کریں گے۔صحابہؓ نے پوچھا: یہ کون خوش نصیب ہوں گے یارسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا: "یہ وہ لوگ ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے محض خدا کے دین کی بنیاد پر محبت کرتے تھے۔نہ آپس میں رشتہ دار تھے اور نہ ان کے درمیان کوئی مالی لین دین کا تعلق تھا۔خدا کی قسم قیامت کے روز ان کے چہرے ونہ صرف یہ کہ نور سے جگمگا رہے ہوں گے بلکہ یہ سراپا نور ہوں گے اور جب سارے لوگ خوف سے کانپ رہے ہوں گے تو انہیں کوئی خوف نہ ہو گا اور جب سارے لوگ غم میں مبتلا ہوں گے اس وقت انہیں قطعاً کوئی غم نہ ہو گا اور آپ نے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

الاان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون

"سنو! اللہ کے چاہنے والوں کے لیے نہ کسی بات کا کوئی خوف ہو گا اور نہ (گزری ہوئی زندگی کے بارے میں) کسی قسم کا غم۔"

حضرت ابوالدرداءؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"قیامت کے روز کچھ لوگ اپنی قبروں سے آئیں گے اور ان کے چہرے نور سے جگمگا رہے ہوں گے، وہ موتیوں کے منبروں پر بٹھائے جائیں گے، لوگ ان کی شان پر رشک کریں گے یہ لوگ نہ نبی ہوں گے، نہ شہید۔ایک بدو نے سوال کیا: "یارسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہیں ہمیں ان کی پہچان بتادیجیے؟ فرمایا: "یہ ہو لوگ ہیں جو آپس میں خدا کی خاطر محبت کرتے ہیں۔"(طبرانی)

۵۔نیک لوگوں سے محبت کو آخرت کی نجات اور خدا کی خوشنودی کا ذریعہ سمجھیے اور خدا سے دعا کیجیے کہ خدایا! نیک لوگوں کی محبت عطا کر اور نیک لوگوں میں شامل فرما۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یارسول اللہ ﷺ! ایک شخص کسی نیک آدمی سے اس کی نیکی کی بنا پر محبت کرتا ہے مگر خود اس شخص جیسے اچھے اعمال نہیں کرتا، ارشاد فرمایا: "کوئی مضائقہ نہیں! آدمی قیامت کے روز اسی کی معیت میں ہو گا جس سے وہ محبت کرے گا۔"(بخاری)

ایک شب نبی ﷺ کو خدا کا دیدار ہوا، خدا نے نبی ﷺ سے کہا مانگیے تو نبی ﷺ نے یہ دعا مانگی:

اللھم انی اسئلك فعل الخیرات و ترك المنکرات وحب المساکین و ان تغفرلی و ترحمنی و اذا اردت فتنۃ فی قوم فتوفنی غیر مفتون و اسئلك حبك و حب من یحبك وحب عمل یقربنی الی حبك (مسند احمد)

"خدایا! میں تجھ سے نیک کاموں کی توفیق چاہتاہوں اور برے کاموں سے بچنے کی قوت چاہتاہوں اور مسکینوں کی محبت چاہتاہوں اور یہ کہ تو میری مغفرت فرمادے اور مجھ پر رحم فرمائے اور جب تو کسی قوم کو عذاب میں مبتلا کرنا چاہیے تو مجھے اس حال میں اٹھا کہ میں اس سے محفوظ رہوں اور مین تجھ سے تیری محبت کا سوال کرتاہوں اور اس شخص کی محبت کا سوال کرتاہوں جو تجھ سے محبت کرتاہے اور اس عمل کی توفیق چاہتاہوں جو تیرے قرب کاذریعہ ہو۔"

اور حضرت معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

"خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مجھ پر واجب ہے کہ میں ان لوگوں سے محبت کروں جو لوگ میری خاطر آپس میں محبت اور دوستی کرتے ہیں اور میرا ذکر کرنے کے لیے ایک جگہ جمع ہوتے ہو کر بیٹھتے ہیں اور میرے محبت کے سبب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور میری خوشنودی چاہنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں۔"(احمد، ترمذی)

نبی ﷺ دو دوستوں کی ملاقات کا ایمان افروز نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ایک شخص اپنے دوست سے جو کسی دوسری بستی میں رہتا تھا ملاقات کے لیے چلا۔ خدا نے اس کے راستہ میں فرشتے کو بٹھا دیا، فرشتے نے اس سے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے جواب دیا، اس گاؤں میں اپنے بھائی سے ملاقات کے لیے جارہاہوں۔ فرشتے نے کہا، کیا تمہارا اس پر کوئی حق نعمت ہے جو وصول کرنے جارہے ہو؟ اس نے کہا نہیں بس اس غرض سے اس کے پاس جارہاہوں کہ میں اس سے خدا کی خاطر محبت کرتاہوں۔ فرشتہ بولا لو سنو! مجھے خدا نے تمہارے پاس بھیجاہے اور یہ بشارت دی ہے کہ وہ بھی تجھ سے ایسی ہی محبت رکھتاہے جیسی تو اس کی خاطر اپنے دوست سے رکھتاہے۔"(مسلم)

۶۔ دوستی ایسے لوگوں سے کیجیے جو اسلامی نقطۂ نظر سے دوستی کے لائق ہوں اور پھر عمر بھر اس دوستی کو نبانے کی کوشش کیجیے، جس طرح یہ ضروری ہے کہ دوستی کے لیے اچھے لوگوں کا انتخاب کیا جائے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ دوستی کو ہمیشہ ہمیشہ بناہنے اور قائم رکھنے کی بھی کوشش کی جائے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز جب عرش الٰہی کے سوا کہیں کوئی سایہ نہ ہوگا۔ اس روز سات قسم کے افراد عرش الٰہی کے سائے میں ہوں گے، ان میں ایک قسم کے افراد وہ دو آدمی ہوں گے جو محض خدا کے لیے ایک دوسرے کے دوست ہوں گے، خدا کی محبت ہی نے ان کو باہم جوڑا ہوگا اور اسی بنیاد پر وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہوں گے یعنی ان کی دوستی خدا کی خاطر ہوگی اور زندگی بھر وہ اس دوستی کو قائم رکھنے اور نباہنے کی کوشش کریں گے اور جب ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے جدا ہو کر دنیا سے رخصت ہو رہاہوگا تو اسی حال میں کہ ان کی یہ دوستی قائم ہوگی اور اسی دوستی کی حالت میں وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں گے۔

۷۔ دوستوں پر اعتماد کیجیے، ان کے درمیان ہشاش بشاش رہیے، افسردہ رہنے اور دوستوں کو افسردہ کرنے سے پرہیز کیجیے، دوستوں کی صحبت میں بے تکلف اور خوش مزاج رہیے، تیوری چڑھانے اور لیے دیے رہنے سے پرہیز کیجیے۔ دوستوں کے ساتھ ایک بے تکلف ساتھ، خوش مزاج ہم نشین اور خوش طبع رفیق بننے کی کوشش کیجیے۔ آپ کی صحبت سے احباب اکتائیں نہیں بلکہ مسرت، زندگی اور کشش محسوس کریں۔

حضرت عبداللہ بن حارثؓ فرماتے ہیں: "میں نے نبی ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔"(ترمذی)

حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی صحبت میں سو مجلسوں سے بھی زیادہ بیٹھا ہوں، ان مجلسوں میں صحابہ کرامؓ اشعار بھی پڑھتے تھے اور زمانہ جاہلیت کے قصے کہانیاں بھی سناتے تھے نبی ﷺ خاموشی سے یہ سب سنتے رہتے تھے بلکہ کبھی کبھی خود بھی ان کے ساتھ ہنسنے میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔(ترمذی)

حضرت شریدؓ کہتے ہیں کہ میں ایک بار نبی ﷺ کے ساتھ سواری پر آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا......واری پر بیٹھے بیٹھے میں نے نبی ﷺ کو امیہ بن صلت کے سو شعر سنائے، ہر شعر پر آپ ﷺ فرماتے کچھ اور سناؤ اور میں سناتا۔(ترمذی)

اسی طرح نبی ﷺ اپنی مجلس میں خود بھی کبھی کبھی قصے سناتے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک بار آپ ﷺ نے گھر والوں کو ایک قصہ سنایا، ایک عورت نے کہا یہ عجیب و غریب قصہ تو بلکل خرافہ کے قصوں کی طرح ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا، تمہیں خرافہ کا صحیح قصہ بھی معلوم ہے اور پھر خود ہی آپ ﷺ نے خرافہ کا اصل قصہ تفصیل سے سنایا۔ اسی طرح ایک بار حضرت عائشہؓ کو گیارہ عورتوں کی ایک بہت ہی دلچسپ کہانی سنائی۔

حضرت بکر بن عبداللہؓ صحابہ کرامؓ کی بے تکلفی اور خوش طبعی کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "صحابہ کرام ہنسی اور تفریح کے طور پر ایک دوسرے کی طرف تربوز کے چھلکے پھینکا کرتے تھے، لیکن جب لڑنے اور مدافعت کرنے کا وقت آتا تو اس میدان کے شہسوار بھی صحابہؓ ہی ہوتے تھے۔"(الادب المفرد)

حضرت محمد بن زیادؓ فرماتے ہیں: "میں نے سلف صالحین کو دیکھا ہے کہ ان کے کئی کئی کنبے ایک ہی حویلی میں رہتے بستے تھے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ ان میں سے کسی ایک کے یہاں مہمان آتا اور کسی دوسرے کے چولہے پر ہانڈی چڑھی ہوتی تو مہمان والا دوست اپنے مہمان کے لیے اپنے دوست کی ہانڈی اتار لے جاتا، بعد میں ہانڈی والا اپنی ہانڈی ڈھونڈتا پھرتا اور لوگوں سے پوچھتا میری ہانڈی کون لے گیا؟ یہ میزبان دوست بتاتا کہ بھائی اپنے مہمان کے لیے ہم لے گئے تھے۔ اس وقت ہانڈی والا کہتا، خدا تمہارے لیے اس میں برکت دے اور محمد بن زیاد فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جب روٹی پکاتے تب بھی یہی صورت حال پیش آتی۔"(الادب المفرد)

حضرت علیؓ کا قول ہے: "دل کو آزاد بھی چھوڑ دیا کرو، خوش کن نکتے بھی سوچا کرو، کیونکہ جسم کی طرح دل بھی تھک جاتا ہے۔"

۸۔ خشک مزاج اور مردہ دل نہ بنیے، خوش طبع اور ہشاش بشاش رہیے، لیکن اس بات کی احتیاط ضرور کیجیے کہ آپ کی خوش طبعی اور ظرافت حد سے بڑھنے نہ پائے خوش مزاجی اور تفریح کے ساتھ ساتھ، دینی وقار، حمیت و غیرت اور توازن و اعتدال کا بھی لحاظ رکھیے۔

نبی ﷺ کے صحابی حضرت عبدالرحمٰنؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کے صحابہؓ خشک مزاج تھے اور نہ مردوں کی سی چال چلتے تھے، وہ اپنی مجلسوں میں شعر و شاعری بھی کرتے تھے اور دور جاہلیت کے قصے کہانیاں بھی بیان کرتے تھے، لیکن جب ان سے کسی معاملے میں حق کے

خلاف کسی بات کا مطالبہ ہوتا تو ان کی آنکھوں کی پتلیاں غصے میں اس طرح پھر جاتیں کہ جیسے ان پر جنون کی کیفیت طاری ہے۔(الادب المفرد)

مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہؒ سے کسی نے کہا کہ مذاق بھی ایک آفت ہے، انہوں نے جواب دیا نہیں بلکہ سنت ہے مگر اس شخص کے لیے جو اس کے مواقع جانتا ہو اور اچھا مذاق کر سکتا ہو۔(شرح شمائل ترمذی)

۹۔آپ جس شخص سے محبت رکھتے ہوں اس سے اپنی محبت کا اظہار ضرور کیجیے۔اس کا نفسیاتی اثر یہ ہو گا کہ اس کو بھی قرب کا احساس ہو گا اور دونوں طرف کے جذبات و احساسات کے تبادلے سے محبت و خلوص میں غیر معمولی اضافہ ہو گا اور پھر محبت محض ایک قلبی کیفیت نہیں رہے گی، بلکہ اس کے تقاضے عملی زندگی پر اثر انداز ہوں گے اور اس طرح شخصی معاملات میں دلچسپی لینے اور زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے قریب ہرنے کا موقع ملے گا۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:"جب کسی شخص کے دل میں اپنے بھائی کے لیے خلوص و محبت کے جذبات ہوں تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے دوست کو بھی ان جذبات سے آگاہ کر دے اور اسے بتا دے کہ وہ اس سے محبت رکھتا ہے۔"(ابوداؤد)

ایک بار آپ ﷺ کے سامنے سے ایک شخص گزرا، کچھ لوگ آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک نے کہا:"یارسول اللہ ﷺ مجھے اس شخص کے ساتھ محض خدا کی خاطر محبت ہے۔یہ سن کر نبی ﷺ نے پوچھا تو کیا تم نے اس شخص کو یہ بات بتادی ہے؟ وہ شخص بولا نہیں تو نبی ﷺ نے فرمایا جاؤ اور اس پر ظاہر کرو کہ تم خدا کے لیے اس سے محبت کرتے ہو، وہ شخص فوراً اٹھا اور جا کر اس جانے والے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا تجھ سے وہ ذات محبت کرے جس کی خاطر تو مجھ سے محبت کرتا ہے۔"(ترمذی،ابوداؤد)

دوستانہ تعلقات کو زیادہ سے زیادہ استوار اور نتیجہ خیز بنانے اور دوستوں سے قریب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ دوستوں کے شخصی اور ذاتی معاملات میں معروف حد تک دلچسپی لیں اور ان سے اپنے قرب اور خصوصی تعلق کا اظہار کریں۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"جب ایک آدمی دوسرے سے دوستی اور اخوت کا رشتہ جوڑے تو اس سے اس کا نام، اس کے باپ کا نام اور اس کے خاندان کے حالات معلوم کر لے کہ اس سے باہمی محبت کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔"(ترمذی)

۱۰۔محبت کے اظہار اور تعلقات کی نوعیت میں ہمیشہ میانہ روی اختیار کیجیے نہ تو ایسی سرد مہری کا مظاہرہ کیجیے کہ آپ کی محبت اور تعلق مشکوک نظر آئے اور نہ ہی جوش محبت میں اتنا آگے بڑھیے کہ آپ کی محبت اور دوستی جنون کی شکل اختیار کر لے اور خدانخواستہ کسی وقت آپ کو پچھتانا پڑے توازن اور اعتدال کا ہمیشہ لحاظ رکھیے اور مستقل مزاجی کے ساتھ ایسی متوازن روش اختیار کیجیے جس کو آپ برابر نباہ سکیں۔ حضرت اسلمؓ کا بیان ہے:

"حضرت عمرؓ نے فرمایا تمہاری محبت جنون کی شکل نہ اختیار کرنے پائے اور تمہاری دشمنی ایذا رسانی کا باعث نہ بننے پائے۔ میں نے کہا حضرت وہ کیسے ؟ آپ نے فرمایا (وہ ایسے کہ ) جب محبت کرنے لگو تو بچوں کی طرح چمٹنے اور طفلانہ حرکتیں کرنے لگو اور جب کیس سے ناراض ہو تو اس کے جان و مال تک کی تباہی اور بربادی کے درپے ہو جاؤ۔" (الادب المفرد)

حضرت عبید کندیؓ فرماتے ہیں: "میں نے حضرت علیؓ سے سنا۔ فرما رہے تھے: "اپنے دوست سے دوستی میں نرمی اور میانہ روی اختیار کرو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت تمہارا دشمن بن جائے اسی طرح دشمن سے دشمنی میں نرمی اور اعتدال کا رویہ اختیار کرو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت تمہارا دوست بن جائے۔" (الاداب المفرد)

۱۱۔ دوستوں کے ساتھ وفاداری اور خیر خواہی کا سلوک کیجیے۔ دوست کے ساتھ سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ آپ اس کو اخلاقی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ اونچا اٹھانے کی کوشش کریں اور اس کی دنیا بنانے سے زیادہ اس کی آخرت بنانے کی فکر کریں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

"دین کا سر تا پیر خیر خواہی ہے۔"

خیر خواہی کا اصل معیار یہ ہے کہ آپ اپنے دوست کے لیے بھی وہی پسند کریں جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں، اس لیے کہ آدمی اپنا برا کبھی نہیں چاہتا۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"اس ذات کی قسم جو کے قبضے میں میری جان ہے: کوئی بندہ مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ بھائی کے لیے بھی وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔"

اور مسلمان پر مسلمان کے چھ حقوق بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

"اور یہ کہ وہ اپنے بھائی کی خیر خواہی چاہے خواہ وہ غائب ہو یا موجود۔"

اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

"بے شک خانے اس شخص پر آگ کو واجب کر دیا ہے اور جنت حرام کر دی ہے جس نے قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارا، صحابہؓ میں سے کسی نے پوچھا: "اگرچہ وہ کوئی معمولی سی چیز ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں اگرچہ وہ پیلو کی معمولی سی شاخ ہی کیوں نہ ہو۔"

۱۲۔ دوستوں کے دکھ درد میں شریک رہیے اور اسی طرح ان کی خوشیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیجیے۔ ان کے غم میں شریک ہو کر غم غلط کرنے کی کوشش کیجیے اور ان کی مسرتوں میں شریک ہو کر مسرتوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کیجیے۔ ہر دوست اپنے مخلصین سے بجا

طور پر توقع رکھتا ہے کہ وہ مصیبت میں اس کا ساتھ دیں گے اور وقت پڑنے پر اس کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔اسی طرح وہ یہ بھی توقع رکھتا ہے کہ اس کے دوست اس کی خوشیوں میں اضافہ کریں اور اس کی اجتماعی تقریبات کی زینت اور رونق بڑھائیں۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔

"ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے کہ ایک دوسرے کو قوت پہنچاتا اور سہارا دیتا ہے جیسے عمارت کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کا سہارا بنتی ہے اور قوت پہنچاتی ہے۔"

اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال دیں (اور اس طرح مسلمانوں کے باہمی تعلق اور قرب کو واضح فرمایا")(بخاری، مسلم)

اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: "تم مسلمانوں کو باہم رحم دلی، باہم الفت و محبت، اور باہم تکلیف کے احساس میں ایسا پاؤ گے جیسے ایک جسم کہ اگر ایک عضو بیمار پڑ جائے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں اس کا شریک رہتا ہے۔"(بخاری، مسلم)

۱۳۔دوستوں سے خوش دلی، نرم خوئی، اور مسرت و اخلاص سے ملیے اور نہایت توجہ اور خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیجیے۔لاپروائی، بے نیازی اور روکھے پن سے پرہیز کیجیے، یہ دلوں کو پھاڑنے والی برائیاں ہیں۔ملاقات کے وقت ہمیشہ مسرت، اطمینان اور شکر و حمد کے کلمات کہیے۔کہ آپ کے دوست، خوشی اور زندگی محسوس کریں ایسے افسردہ چہرے سے ان کا استقبال نہ کیجیے کہ ان کا دل بجھ جائے وہ آپ کی ملاقات کو وبالِ جان سمجھنے لگیں۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:۔

"نیکیوں میں کسی نیکی کو حقیر نہ جانو چاہے وہ اتنی ہی ہو کہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو۔"(مسلم)

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "اپنے بھائی کو دیکھ کر تمہارا مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔"(ترمذی)

نرم خوئی، خوش اخلاقی اور نرمی سے ہی دونوں میں الفت و محبت پیدا ہوتی ہے اور انہی صفات کی بدولت اچھا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

نبی ﷺ فرماتے ہیں:

"میں تمہیں اس آدمی کی پہچان بتاتا ہوں جس پر جہنم کی آگ حرام ہے اور وہ آگ پر حرام ہے یہ وہ آدمی ہے جو نرم مزاج ہو، نرم طبیعت ہو اور نرم خو ہو۔"(ترمذی)

صحابہؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ جب ملاقات کے وقت کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پورے جسم سے متوجہ ہوتے اور جب کوئی آپ ﷺ پوری طرح متوجہ ہو کر اس کی بات سنتے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ایک شخص آیا تو آپ ﷺ نے اپنے جسم کو حرکت دی اور ذرا سمٹے،اس شخص نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! جگہ تو کشادہ ہے،نبی ﷺ نے فرمایا:

"مسلمان کا یہ حق ہے کہ جب اس کا بھائی اسے دیکھے تو وہ اس کے لیے ذرا اپنے جسم کو حرکت دے۔"(بیہقی)

مومنین کی تعریف میں قرآن کا ارشاد ہے:

اذلۃ علی المومنین

"وہ مومنوں کے لیے بڑے نرم خو ہوتے ہیں۔"

اور نبی ﷺ نے اس حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے:

"مومن بردبار اور نرم خو ہوتے ہیں اس اونٹ کی طرح جس کی ناک میں نکیل پڑی ہو،اس کو کھینچا جائے تو وہ کھنچتا چلا آئے اور پتھر پر بٹھایا جائے تو پتھر پر بیٹھ جائے۔"(ترمذی)

۱۴۔اگر کبھی کسی بات پر اختلاف ہو جائے تو فوراً صلح صفائی کر لیجیے اور ہمیشہ معافی طلب کرنے اور اپنے قصور کا اعتراف کرنے میں پیش قدمی کیجیے۔

حضرت ابوالدرداؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ میں کسی معاملے میں سخت کلامی ہو گئی۔بعد میں حضرت ابو بکرؓ کو بہت احساس ہوا اور وہ انتہائی مغموم نبی ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور فرمایا: یارسول اللہ ﷺ! میرے اور عمرؓ کے درمیان کچھ اختلاف ہو گیا مجھے غصہ آگیا اور کچھ سخت باتیں ہو گئیں۔مجھے بعد میں بڑی شرمندگی ہوئی اور میں عمرؓ سے معافی چاہی لیکن یارسول اللہ ﷺ! وہ معاف کرنے کو تیار نہ ہوئے۔میں پریشان ہو کر آپ ﷺ کی خدمت میں آیا۔نبی ﷺ نے فرمایا خدا تمہیں معاف فرمائے گا اور تمہیں بخش دے گا،اسی دوران حضرت عمرؓ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ دوڑے دوڑے حضرت ابو بکرؓ کے گھر پہنچے وہاں معلوم ہوا کہ ابو بکرؓ نبی ﷺ کی خدمت میں گئے ہیں تو وہ بھی اسی وقت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔حضرت عمرؓ کو دیکھ کر نبی ﷺ کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔یہ دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ بہت ڈرے اور نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ گھٹنوں کے بل ہو کر نبی ﷺ سے عرض کیا،"یارسول اللہ ﷺ! عمرؓ کا کوئی قصور نہیں۔قصور سارا میرا ہی ہے میں نے زیادتی کی ہے اور میں نے ہی انہیں سخت سست کہا ہے۔"

یہ دیکھ کر نبی ﷺ نے فرمایا:

"خدا نے مجھے تمہارے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا اور جب ابتداء میں تم لوگ مجھے جھٹلا رہے تھے اس وقت ابو بکرؓ نے میری تصدیق کی اور جان و مال سے ہر طرح میرا ساتھ دیا تو کیا اب تم میرے ساتھی کو رنجیدہ کر کے چھوڑو گے؟"

صلح صفائی کی کوشش میں کبھی تاخیر نہ کیجیے، جتنی تاخیر ہوتی جاتی ہے اتنی ہی خرابی جڑ پکڑتی جاتی ہے اور دلوں میں دوری پیدا ہوتی جاتی ہے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ نصیحت بڑی ہی ایمان افروز ہے:

"پس اگر تو قربان گاہ پر اپنی نذر گزارتا ہو اور وہاں تجھے عاد آئے کہ بھائی کو مجھ سے شکایت ہے تو وہیں قربان گاہ کے آگے ہی اپنی نذر چھوڑ دے اور جا کر اپنے بھائی سے ملاپ کر تب اپنی نذر گزار۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"لوگوں کے اعمال ہر پیر اور جمعرات کو ہفتہ میں دو روز پیش ہوتے ہیں اور ہر مومن کو بخش دیا جاتا ہے سوائے اس کے جس کے دل میں اپنے مومن بھائی سے کوئی عداوت ہو کہا جاتا ہے ان کو چھوڑ دو تاکہ یہ آپس میں صلح کر لیں۔"

کسے معلوم کہ آئندہ لمحہ زندگی کا ہے یا موت کا اور کون جانتا ہے کہ اسے پیر یا جمعرات کا دن زندگی میں دیکھنا نصیب ہو گا یا نہیں تو پھر قلب کی صفائی اور دوستوں کی شکایت دور کرنے میں تاخیر کیوں اور کس امید پر؟ کیا یوم آخر پر یقین رکھنے والا ہوش منداس کے لیے تیار ہے کہ وہ کھوٹ کھپٹ سے بھرا ہوا تاریک اور گھناؤنا دل لے کر خدا کے حضور پہنچے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس کا بھی خیال رکھیے کہ جب آپ کا دوست اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور معافی چاہے تو اس کا عذر قبول کیجیے اور اس کو معافکر دیجیے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"جس نے کسی مسلمان بھائی سے اپنی غلطی پر عذر کیا اور اس نے اس کو معذور نہ سمجھا اس کے عذر کو قبول نہ کیا اس پر اتنا گناہ ہو گا جتنا ایک ناجائز محصول وصول کرنے والے پر اس ظلم و زیادتی کا گناہ ہوتا ہے۔"

۱۵۔ دوستوں کی جانب سے اگر کوئی بات طبیعت اور ذوق کے خلاف بھی ہو جاۓ تو آپ اپنی زبان پر قابو رکھیے اور جواب مین کبھی سخت کلامی یا بدزبانی نہ کیجیے بلکہ حکمت اور نرمی کے ساتھ بات کو ٹال جایئے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے پوچھا۔ اے میرے رب! آپ کے نزدیک آپ کے بندوں میں کون سب سے پیارا ہے خدا نے جواب دیا وہ جو انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود معاف کر دے گا۔" (مشکوۃ)

اور نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

"مومن کی میزان میں قیامت کے روز جو سب سے زیادہ وزنی چیز رکھی جائے گی وہ اس کا حسن اخلاق ہو گا اور خدا کو وہ شخص بڑا ہی مبغوض ہے جو زبان سے بے حیائی کی بات نکالتا اور بدزبانی کرتا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے حسن اخلاق کی تعریف تین باتوں سے فرمائی ہے۔

(ا)۔جب آدمی کسی سے ملے تو ہنستے چہرے سے ملے۔

(۲)۔خدا کے محتاج اور ضرورت مندوں پر خرچ کرے۔

(۳)۔اور کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خدا کی نظر میں بدترین آدمی قیامت کے روز وہ ہو گا جس کی بدزبانی اور فحش کلامی کی وجہ سے لوگ اسے ملنا چھوڑ دیں۔" (بخاری، مسلم)

۱۶۔اپنے دوستوں کی اصلاح و تربیت سے کبھی غفلت نہ کیجیے اور اپنے دوستوں میں وہ بیماری کبھی نہ پیدا ہونے دیجیے جو اصلاح و تربیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔یعنی خود پسندی اور کبر، دوستوں کو ہمیشہ آمادہ کرتے رہیے کہ وہ اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کو محسوس کریں، اپنی خطاؤں کے اعتراف مین جرأت سے کام لیں اور اس حقیقت کو ہمہ وقت نگاہ میں رکھیں کہ اپنی کوتاہی کو محسوس نہ کرنے اور اپنی جرأت پر اصرار کرنے سے نفس کو بدترین غذا ملتی ہے۔

دراصل نمائشی عاجزی دکھانا، الفاظ میں حقیر کہنا، رفتار اور انداز میں خشوع کا اظہار کرنا۔یہ نہایت آسان ہے لیکن اپنے نفس پر چوٹ سہنا، اپنی کوتاہیوں کو ٹھنڈے دماغ سے سننا اور تسلیم کرنا اور اپنے نفس کے خلاف دوستوں کی تنقید برداشت کرنا انتہائی مشکل کام ہے لیکن حقیقی دوست وہی ہیں جو بیدار ذہن کے ساتھ ایک دوسرے کی زندگی پر نگاہ رکھیں اور اس پہلو سے ایک دوسرے کی تربیت و اصلاح کرتے ہوئے کبر اور خود پسندی سے بچاتے رہیں۔

نبی ﷺ فرماتے ہیں:

"تین باتیں ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں۔

(ا)۔ایسی خواہش کہ انسان اس کا تابع اور غلام بن کر رہ جائے۔

(۲)۔ایسی حرص جس کو پیشوا مان کر آدمی اس کی پیروی کرنے لگے۔

(۳)۔خود پسندی.........اور یہ بیماری ان تینوں میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔" (بیہقی، مشکوٰۃ)

تنقید اور احتساب ایک ایسا نشتر ہے جو اخلاقی وجود کے تمام فاسد مادوں کو باہر نکال پھینکتا ہے اور اخلاقی توانائیوں میں خاطر خواہ اضافہ کر کے فرد اور معاشرے میں نئی زندگی کی روح پھونک دیتا ہے۔ دوستوں کے احتساب اور تنقید پر بپھرنا، ناک بھوں چڑھانا اور خود کو اس سے بے نیاز سمجھنا بھی ہلاکت ہے اور اس خوشگوار فریضے کو ادا کرنے میں کوتاہی برتنا بھی ہلاکت ہے۔ دوستوں کے دامن پر گھناؤنے دھبے نظر آئیں تو بے چینی محسوس کیجیے اور انہیں صاف کرنے کی حکیمانہ تدبیریں کیجیے اور اسی طرح خود بھی فراخ دلی اور عاجزی کے ساتھ دوستوں کو یہ موقع دیجیے کہ وہ آپ کے داغ دھبوں کو آپ پر نمایاں کریں اور جب وہ یہ تلخ فریضہ انجام دیں تو اپنے نفس کو بھلانے کے بجائے انتہائی عالی ظرفی، خوش دلی اور احسان مندی کے جذبات سے ان کی تنقید کا استقبال کیجیے اور ان کے اخلاص و کرم کا شکریہ ادا کیجیے۔ نبی ﷺ نے مثالی دوستی کی اس کیفیت کو ایک بلیغ تمثیل سے اس طرح واضح فرمایا:

"تم میں سے ہر ایک "اپنے بھائی کا آئینہ " ہے پس اگر وہ اپنے بھائی میں کوئی خرابی دیکھے تو اسے دور کر دے۔"(ترمذی)

اس تمثیل میں پانچ ایسے روشن اشارے ملتے ہیں جس کو پیش نظر رکھ کر آپ اپنی دوستی کو واقعی مثالی دوستی بنا سکتے ہیں۔

(۱)۔آئینہ آپ کے داغ دھبے اسی وقت ظاہر کرتا ہے جب آپ اپنے داغ دھبے دیکھنے کے ارادے سے اس کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں اور جب آپ اس کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں تو وہ بھی مکمل خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔

اسی طرح آپ بھی دوست کے عیوب اسی وقت واضح کریں جب وہ خود کو تنقید کے لیے آپ کے سامنے پیش کرے اور فراخ دلی سے تنقید و احتساب کا موقع دے اور آپ بھی محسوس کریں کہ اس وقت اس کا ذہن تنقید سننے کے لیے تیار ہے اور دل میں اصلاح قبول کرنے کے لیے جذبات موجزن ہیں اور اگر آپ یہ کیفیت نہ پائیں تو حکمت کے ساتھ اپنی بات کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھیں اور خاموشی اختیار کریں اور اس کی غیر موجودگی میں تو اس قدر احتیاط کریں کہ آپ کی زبان پر کوئی ایسا لفظ بھی نہ آئے جس سے اس کے کسی عیب کی طرف اشارہ ہوتا ہو اس لیے کہ یہ غیبت ہے اور غیبت سے دل جڑتے نہیں بلکہ پھٹتے ہیں۔

(۲)۔آئینہ چہرے کے انہی داغ دھبوں کی صحیح صحیح تصویر پیش کرتا ہے جو فی الواقع چہرے پر موجود ہوتے ہیں۔ نہ وہ کم بتاتا ہے اور نہ وہ ان کی تعداد کو بڑھا کر پیش کرتا ہے۔ پھر وہ چہرے کے صرف انہی عیوب کو نمایاں کرتا ہے جو اس کے سامنے آتے ہیں، وہ چھپے ہوئے کا تجسس نہیں کرتا اور نہ کرید کرید کر عیوب کی کوئی خیالی تصویر پیش کرتا ہے۔ اسی طرح آپ بھی اپنے دوست کے عیوب بلاکم و کاست بیان کریں نہ تو بے جا مروت اور خوشامد میں عیوب چھپائیں اور نہ اپنی خطابت اور زورِ بیان سے اس میں اضافہ کریں اور پھر صرف وہی عیوب بیان کریں جو عام زندگی سے آپ کے سامنے آئیں۔ تجسس اور ٹوہ میں نہ لگیں پوشیدہ عیبوں کو کریدنا کوئی اخلاقی خدمت نہیں بلکہ ایک تباہ کن اور اخلاق سوز عیب ہے۔

نبی ﷺ ایک بار منبر پر چڑھے اور نہایت اونچی آواز میں آپ ﷺ نے حاضر کو تنبیہ فرمائی۔

"مسلمانوں کے عیوب کے پیچھے نہ پڑو جو شخص اپنے مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کے پوشدہ عیوب کے درپے ہوتا ہے تو پھر خدا اس کے پوشیدہ عیوب کو طشت از بام کرنے پر تل جاتا ہے اور جس کے عیب افشا کرنے پر خدا تل جائے تو وہ اس کو رسوا کر کے ہی چھوڑتا ہے اگرچہ وہ اپنے گھر کے اندر گھس کر ہی کیوں نہ بیٹھ جائے۔" (ترمذی)

(۳)۔آئینہ غرض سے پاک ہو کر بے لاگ انداز میں اپنا فرض ادا کرتا ہے اور جو شخص بھی اس کے سامنے اپنا چہرہ پیش کرتا ہے وہ بغیر کسی غرض کے اس کا صحیح صحیح نقشہ اس کے سامنے رکھ دیتا ہے نہ وہ کسی سے بغض اور کینہ رکھتا ہے اور نہ کسی سے انتقام لیتا ہے۔آپ بھی ذاتی اغراض، جذبہ انتقام، بغض و کینہ اور ہر طرح کی بدنیتی سے پاک ہو کت بے لاگ احتساب کیجیے اور اس لیے کیجیے کہ آپ کا دوست اپنے کو سنوار لے جس طرح آئینہ کو دیکھ کر آدمی اپنے کو سنوار لیتا ہے۔

(۴)۔آئینہ میں اپنی صحیح تصویر دیکھ کر نہ تو کوئی جھنجھلاتا ہے اور نہ غصے سے بے قابو ہو کر آئینہ توڑ دینے کی حماقت کرتا ہے، بلکہ فوراً اپنے کو سنوارنے میں لگ جاتا ہے اور دل ہی دل میں آئینے کی قدر و قیمت محسوس کرتے ہوئے زبان حال سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہے اور کہتا ہے واقعی آئینے نے میرے بنانے سنوارنے میں میری بڑی مدد کی اور فطری فریضہ انجام دیا اور پھر نہایت احتیاط کے ساتھ دوسرے وقت کے لیے اس کو بحفاظت رکھ دیتا ہے،اسی طرح آپ کا دوست اپنے الفاظ کے آئینے میں آپ کے سامنے آپ کی صحیح تصویر رکھے تو جھنجھلا کر دوست پر جوابی حملہ نہ کریں، بلکہ اس کے شکر گزار ہوں کہ اس نے دوستی کا حق ادا کیا اور نہ صرف زبان سے بلکہ دل سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس لمحے سے اپنی اصلاح و تربیت کے لیے فکر مند ہو جائیں اور انتہائی فراخ دلی اور احسان مندی کے ساتھ دوست کی قدر و عظمت محسوس کرتے ہوئے اس سے درخواست کریں کہ آئندہ بھی وہ آپ کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتا رہے۔

(۵)۔اور آخری اشارہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ہر ایک "اپنے بھائی کا آئینہ" ہے اور بھائی بھائی کے لیے اخلاص و محبت کا پیکر ہوتا ہے، وفادار اور خیر خواہ ہوتا ہے، ہمدرد اور غمگسار ہوتا ہے، بھائی کو مصیبت میں دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور خوش دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے اس لیے بھائی اور دوست جو تنقید کرے گا اس میں انتہائی دل سوزی اور غم خواری ہو گی، محبت اور خلوص ہو گا، بے پایاں درد مندی اور خیر خواہی ہو گی اور لفظ لفظ جذبۂ اصلاح کا آئینہ ہو گا اور ایسی تنقید سے دلوں کو جوڑنے اور زندگیوں کو بنانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

۱۷۔دوستوں سے خلوص و محبت کا اظہار کرنے اور محبت کو اور زیادہ بڑھانے کے لیے ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ بھی کیجیے۔ہدیوں کے لینے دینے سے دل جڑتے ہیں اور محبتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجا کرو تو آپس محبت پیدا ہو گی اور دلوں کی کدورت جاتی رہے گی۔" (مشکوٰۃ)

نبی ﷺ خود اپنے اصحابؓ کو کثرت سے ہدیے دیتے تھے اور آپ ﷺ کے صحابہؓ بھی آپس میں کثرت سے ایک دوسرے کو ہدیے اور تحفے دیتے رہتے تھے۔

ہدیہ دیتے وقت اپنی حیثیت کو سامنے رکھیے اور یہ نہ سوچیے کہ آپ جس کو ہدیہ دیں قیمتی ہدیہ دیں، جو میسر ہو دیجیے، ہدیہ کے قیمتی ہونے نہ ہونے کا انحصار آپ کے اخلاص اور جذبات پر ہے اور یہی اخلاص و جذبات دلوں کو جوڑتے ہیں۔ ہدیے کی قیمت نہیں جوڑتی، اسی طرح دوست کے ہدیے کو بھی کبھی حقیر نہ سمجھیے اس کے اخلاص و محبت پر نگاہ رکھیے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "اگر مجھے تحفے میں کوئی بکری کا ایک پایا بھی پیش کرے تو میں ضرور قبول کروں گا۔ اگر کوئی دعوت میں ایک پایا ہی کھلائے تو میں ضرور اس کی دعوت میں جاؤں گا۔" (ترمذی)

ہدیے کے بدلے میں ہدیہ ضرور دیجیے۔ نبی ﷺ اس کا اہتمام فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے نزدیک پسندیدہ تحفہ، خشبو کا تحفہ تھا۔ آپ بھی اس تحفے کو پسندیدہ سمجھیے اور آج کے حالات میں کتاب بھی بہترین تحفہ ہے۔

اسی سلسلہ میں کبھی کبھی ساتھ مل کر کھانے پینے کا بھی اہتمام کیجیے۔ دوستوں کو اپنے یہاں کھانے پر بلائیے، دوست احباب دعوت کریں تو نہایت خوشی سے ان کی یہاں جائیے۔ اس سے بھی محبت اور خلوص کے جذبات بڑھتے اور مستحکم ہوتے ہیں البتہ اس طرح کے مواقع پر غیر معمولی تکلفات برتنے اور سامان خورد ونوش میں فراوانی دکھانے کے بجائے آپ اخلاص و محبت کے جذبات کی مقدار بڑھانے پر زیادہ توجہ دیجیے۔

۱۸۔ دوستوں کی خبر گیری کیجیے۔ ضرورتوں میں ان کے کام آیئے اور ہر طرح جان ومال سے ان کی مدد کیجیے۔ اصبہانی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک آدمی آیا اور پوچھا کہ لوگوں میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ آپ نے جواب دیا:

"تمام لوگوں میں خدا کے نزدیک محبوب وہ آدمی ہے جو انسانوں کو زیادہ نفع پہنچانے والا ہو اور اعمال میں خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ یہ ہے کہ تو کسی مسلمان کو خوش کر دے۔ اس طرح کہ اس کی مصیبت و مشکل دور کرے یا اس کی بھوک مٹا دے اور یہ بات کہ میں کسی بھائی کے ساتھ اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے جاؤں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں (نبی ﷺ کی) اس مسجد مین اعتکاف کروں اور جس شخص نے اپنا غصہ اس حال میں پی لیا کہ اگر وہ چاہتا تو اپنے غصہ کو پورا کر لیتا تو قیامت کے روز خدا اس کے دل کو اپنی خوشنودی سے بھر دے گا اور جو اپنے بھائی کے ساتھ اس کی ضرورت پوری کرنے کی خاطر چلا اور اس کی وہ ضرورت پوری کر دی تو خدا اس کے دونوں قدموں کو اس دن ثبات بخشے گا جب قدم لڑکھڑا رہے ہوں گے۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو کسی مسلمان کی کوئی مصیبت دور کرے گا تو خدا قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔" (بخاری، مسلم)

اور آپ ﷺ نے فرمایا: "خدا اپنے بندے کی مدد میں اس وقت تک لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔" (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "کسی مسلمان کی حاجت پوری کرنے کا اجر و ثواب دس سال کے اعتکاف سے بھی زیادہ ہے۔" (طبرانی)

اور حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو آدمی اپنے مسلمان بھائی کے پاس خوشی اور مسرت کی بات لے کر پہنچا ہے اور اس بات سے اس کو خوش کر دیتا ہے تو خدا قیامت کے دن اس بندے کو خوش کر دے گا۔" (طبرانی)

۱۹۔ بہترین رازدار بنیے۔ دوست آپ پر اعتماد کر کے آپ سے دل کی بات کہہ دے تو اس کی حفاظت کیجیے۔ اور کبھی دوست کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگائیے۔ اپنے سینے کو رازوں کا محفوظ دفینہ بنائیے تاکہ دوست بغیر کسی جھجک کے ہر معاملہ میں مشورہ لے سکے۔ اور آپ دوست کو اچھے مشورے دے سکیں اور تعاون کر سکیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ حفصہؓ جب بیوہ ہوئیں تو میں عثمانؓ سے ملا اور کہا کہ اگر تم چاہو تو حفصہ کا نکاح تم سے کر دوں، عثمانؓ نے جواب دیا میں اس معاملے پر غور کروں گا، میں نے کئی راتوں تک ان کا انتظار کیا پھر عثمانؓ مجھ سے ملے اور بولے میرا ابھی شادی کرنے کا خیال نہیں ہے، پھر میں ابو بکر کے پاس گیا اور کہا اگر آپ پسند فرمائیں تو حفصہؓ کو اپنی زوجیت میں لے سکتے ہیں۔ وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا مجھے ان کی خاموشی بہت کھلی، عثمانؓ سے بھی زیادہ کھلی۔ اس طرح کئی دن گزر گئے پھر نبی ﷺ نے حفصہؓ کا پیغام بھیجا اور میں نے نبی ﷺ سے حفصہؓ کا نکاح کر دیا۔ اس کے بعد ابو بکرؓ مجھ سے ملے اور فرمایا: تم نے مجھ سے حفصہؓ کا ذکر کیا تھا اور میں نے خاموشی اختیار کی تھی ہو سکتا ہے تمہیں میری خاموشی سے تکلیف ہوئی ہو۔ میں نے کہا ہاں تکلیف تو ہوئی تھی۔

فرمایا: مجھے معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا خود ایسا خیال ہے اور یہ آپ کا ایک راز تھا جس کو میں ظاہر کرنا نہ چاہتا تھا۔ اگر نبی ﷺ ذکر نہ فرماتے تو میں ضرور قبول کر لیتا۔ (بخاری)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں لڑکوں میں کھیل رہا تھا کہ اتنے میں نبی ﷺ تشریف لائے اور ہمیں سلام کیا پھر اپنی ایک ضرورت بتا کر مجھے بھیجا مجھے اس کام کے کرنے میں دیر لگی۔ کام سے فارغ ہو کر جب میں گھر گیا تو ماں نے پوچھا: اتنی دیر کہاں لگائی! میں نے کہا: نبی ﷺ نے اپنی ایک ضرورت سے بھیجا تھا۔ بولیں کیا ضرورت تھی؟ میں نے کیا وہ راز کی بات ہے۔ ماں نے کہا دیکھو رسول اللہ ﷺ کا راز کسی کو نہ بتانا۔ (مسلم)

۲۰۔ اجتماعی اخلاق میں ایسی وسعت، ہمہ جہتی، تحمل اور سمائی پیدا کیجیے کہ ہر ذوق و طبیعت اور ہر فکر و رجحان رکھنے والا آپ کی ذات میں غیر معمولی کشش محسوس کرے اور آپ ہر ایک کے مخصوص ذوق و رجحان اور مخصوص افتادِ طبع کی رعایت کرتے ہوئے ایسا حکیمانہ سلوک کیجیے کہ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ ہر ایک کو اپنے مخصوص ذوق کے پیمانے سے ناپنے کی غیر حکیمانہ کوشش نہ کیجیے اور نہ ہر ایک کو اپنی افتادِ طبع پر ڈھالنے کی ناکام اور مہمل کوشش کیجیے، ذوق و طبیعت کا اختلاف ایک فطری حسن ہے فطرت کے حسن کو مصنوعی حسن کی بیجا توقع میں مسخ نہ کیجیے۔ ہر دوست کو اس کے فطری مقام پر رکھتے ہوئے اس سے دلچسپی لیجیے اور اس کی قدر و عظمت کیجیے اور اپنے ہمہ گیر اخلاق کے ذریعہ اس کو اپنی ذات سے وابستہ رکھنے کی کوشش کیجیے۔

نبی ﷺ کی ہمہ جہتی عبقریت ہی کا یہ کمال تھا کہ ہر ذوق اور ہر طبیعت کا انسان آپ کی مجلس میں سکون پاتا اور اپنی افتاد طبع کی حکیمانہ رعایت پاتے ہوئے کوئی ادنی اجنبیت بھی محسوس نہ کرتا۔آپ کی مجلس میں ابو بکرؓ جیسے سراپا حلم و شفقت بھی تھے اور عمر فاروقؓ جیسے برہنہ شمشیر بھی، حسان بن ثابتؓ جیسے جنگ سے لرزنے والے بھی اور علیؓ جیسے فاتح خیبر بھی، ابوذر غفاری جیسے فقیر منش، غم پسند بھی، اور عبدالرحمن بن عوفؓ جیسے صاحب دولت و جمال بھی۔لیکن نبیو کے وسعت اخلاق، اعلی کردار، اور حسن فکر و تدبیر کا کمال یہ تھا کہ یہ بھی سب نبی ﷺ کی ذات سے بے مثال والہانہ عشق رکھتے اور نبی ﷺ بھی ان کا اس قدر لحاظ رکھتے کہ ہر ایک یہ سمجھتا کہ شاید نبی ﷺ سب سے زیادہ مجھی کو چاہتے ہیں، اور اس وسعت اخلاق، حسن فکر و تدبیر اور غیر معمولی ایثار کی بدولت آپ نے صحابہ کرامؓ کا وہ مثالی جتھہ تیار کیا جن میں طبیعتوں کے باہمی اختلاف کے باوجود وہ بے مثال یکجہتی، غیر معمولی اتحاد و تعاون اور قابل رشک الفت و لگاؤ تھا کہ انسانی تاریخ اپنے ان صفحات کو بجا طور پر اپنی طویل عمر کا حاصل سمجھتی ہے۔

آپ کی دوستیاں در حقیقت اسی وقت کامیاب اور پائیدار ہو سکتی ہیں جب آپ اجتماعی اخلاق میں حکیمانہ لچک اور غیر معمولی صبر و تحمل پیدا کریں اور دوستانہ تعلقات میں رواداری، عفو درو گزر، فیاضانہ برتاؤ، جذباتی ایثار، باہمی مراعات، کسر و انکسار، ایک دوسرے کے جذبات کا پاس و لحاظ اور خیر خواہی کا ضروری حد تک اہتمام کریں۔نبی ﷺ کے چند واقعات سے اندازہ کیجیے کہ آپ کس عالی ظرفی، فراخ دلی، تحمل و بردباری اور رواداری کے ساتھ لوگوں کی فطری ضروریات، جذبات اور کمزوریوں کا لحاظ فرماتے تھے۔"میں نماز کے لیے آتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ لمبی نماز پڑھاؤں پھر کسی بچے کے رونے کی آواز کان میں آتی ہے تو میں نماز کو مختصر کر دیتا ہوں کیونکہ مجھ پر یہ بات انتہائی گراں ہے کہ میں نماز کو طول دے کر بچے کی ماں کو زحمت میں مبتلا کروں۔"(بخاری)

حضرت مالک بن الحویرثؓ فرماتے ہیں کہ "ہم چند ہم عمر نوجوان دین کا علم حاصل کرنے کے لیے نبی ﷺ کے یہاں پہنچے۔ہم نے بیس دن آپ ﷺ کے یہاں قیام کیا، نبی ﷺ انتہائی رحیم و نرم معاملہ کرنے والے تھے۔(جب آپ ﷺ کے یہاں رہتے ہوئے ہمیں بیس دن ہو گئے تو) آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ ہم گھر جانے کے شوق میں ہیں تو آپ ﷺ نے ہم سے پوچھا تم اپنے گھروں میں اپنے پیچھے کن کن لوگوں کو چھوڑ آئے ہو۔ہم نے گھر کے حالات بتائے تو آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ اپنے بیوی بچوں میں واپس جاؤ اور ان کے درمیان رہ کر انہیں بھی وہ سکھاؤ جو تم نے سیکھا ہے۔اور انہیں بھلے کاموں کی تلقین کرو اور فلاں فلاں نماز فلاں وقت پڑھو اور جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی اذان دے دے اور جو تم لوگوں میں علم و اخلاق کے لحاظ سے بڑھا ہوا ہو وہ نماز پڑھائے۔"(بخاری، مسلم)

حضرت معاویہ بن حکم سلمیؓ اپنا قصہ سناتے ہیں کہ "میں نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں ایک آدمی کو چھینک آئی، نماز پڑھتے ہی میری زبان سے: یرحمک اللہ "نکل گیا تو لوگ مجھے گھورنے لگے میں نے کہا خدا تمہیں سلامت رکھے مجھے کیوں گھور رہے ہو! پھر جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے خاموش رہنے کو کہہ رہے ہیں تو میں خاموش ہو گیا جب نبی ﷺ نماز سے فارغ ہو گے.........میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان میں نے نبی ﷺ سے زیادہ بہتر تعلیم و تربیت کرنے والا نہ تو پہلے دیکھا نہ بعد میں۔آپ ﷺ نے نہ تو مجھے ڈانٹا، نہ مارا اور نہ برا بھلا کہا، صرف اتنا کہا: "یہ نماز ہے، نماز میں بات چیت کرنا مناسب نہیں۔نماز تو نام ہے خدا کی پاکی بیان کرنے کا، اس کی بڑائی بیان کرنے کا اور قرآن پڑھنے کا۔"(مسلم)

۲۱۔ دعا کا خصوصی اہتمام کیجیے خود بھی دوستوں کے لیے دعا کیجیے اور ان سے بھی دعا کی درخواست کیجیے۔ دعا دوستوں کے سامنے بھی کیجیے اور ان کی عدم موجودگی میں بھی، عدم موجودگی میں دوستوں کا خیال کر کے اور ان کا نام لے کر بھی دعا کیجیے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں: "میں نے نبی ﷺ سے عمرہ کی اجازت چاہی۔" آپ ﷺ نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا: "اے میرے بھائی اپنی دعاؤں میں ہمیں نہ بھولنا۔" حضرت عمرؓ کہتے ہیں: "مجھے اس بات سے اتنی خوشی ہوئی کہ اگر اس کے بدلے مجھے پوری دنیا بھی ملتی تو اتنی خوشی نہ ہوتی۔"

نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لیے غائبانہ دعا کرتا ہے تو خدا اس کو قبول فرماتا ہے اور دعا کرنے والے کے سرہانے ایک فرشتہ مقرر رہتا ہے کہ جب وہ شخص اپنے بھائی کے لیے اچھی دعا کرتا ہے تو فرشتہ آمین کہتا ہے اور کہتا ہے تیرے لیے بھی وہی کچھ ہے جو تو اپنے بھائی کے لیے مانگ رہا ہے۔" (صحیح مسلم)

اپنی مخلصانہ دعاؤں میں خدا سے درخواست کرتے رہیے کہ خدایا! ہمارے دلوں سے بغض و عناد اور کدورتوں کو غبار سے دھو دے اور ہمارے سینوں کو خلوص و محبت سے جوڑ دے اور ہمارے تعلقات کو باہمی اتحاد و الفت کے ذریعے خوشگوار بنا۔

قرآن پاک کی اس دعا کا بھی اہتمام کیجیے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

"اے ہمارے رب! ہماری اور ہمارے بھائیوں کی مغفرت فرما جو ایمان میں ہم سے سبقت لے گئے اور ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کینہ اور کدورت نہ رہنے دے۔ اے ہمارے رب! تو بڑا ہی مہربان اور بہت ہی رحم فرمانے والا ہے۔"

میز بانی کے آداب

۱۔ مہمان کے آنے پر خوشی اور محبت کا اظہار کیجیے اور نہایت خوش دلی، مسرت قلب اور عزت و اکرام کے ساتھ اس کا استقبال کیجیے۔ تنگ دلی، بے رخی، سرد مہری، اور کڑھن کا اظہار ہرگز نہ کیجیے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "جو لوگ خدا اور یوم آخر پر یقین رکھتے ہیں انہیں اپنے مہمان کی خاطر تواضع کرنی چاہیے۔" (بخاری، مسلم)

خاطر تواضع کرنے میں وہ ساری ہی باتیں داخل ہیں جو مہمان کے اعزاز و اکرام، آرام و راحت، سکون و مسرت اور تسکین جذبات کے لیے ہوں، خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آنا، ہنسی خوشی کی باتوں سے دل بہلانا، عزت و اکرام کے ساتھ بیٹھنے لیٹنے کا انتظام کرنا۔ اپنے معزز دوستوں سے تعارف اور ملاقات کرانا، اس کی ضروریات کا لحاظ رکھنا، نہایت خوش دلی اور فراخی کے ساتھ کھانے پینے کا انتظام کرنا اور خود بنفس نفیس خاطر مدارت میں لگے رہنا یہ سب ہی باتیں "اکرام ضیف" میں داخل ہیں۔

"نبی ﷺ کے پاس جب معزز مہمان آتے تو آپ ﷺ خود بنفس نفیس ان کی خاطر داری فرماتے۔"

جب آپ ﷺ مہمان کو اپنے دستر خوان پر کھانا کھلاتے تو بار بار فرماتے: "اور کھائیے اور کھائیے۔" جب مہمان خوب آسودہ ہو جاتا اور انکار کرتا تب آپ ﷺ اصرار سے باز آتے۔

۲۔ مہمان کے اانے پر سب سے پہلے اس سے سلام دعا کیجیے اور خیر وعافیت معلوم کیجیے۔ قرآن میں ہے:

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ (سورہ الذاریات)

"کیا آپ کو ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی پہنچی ہے کہ جب وہ ان کے پاس آئے تو آتے ہی سلام کیا۔ ابراہیمؑ نے جواب میں سلام کیا۔"

۳۔ دل کھول کر مہمان کی خاطر تواضع کیجیے اور جو اچھے سے اچھا میسر ہو مہمان کے سامنے فوراً پیش کیجیے۔ حضرت ابراہیمؑ کے مہمان جب آئے تو حضرت ابراہیمؑ فوراً ان کے کھانے پینے کے انتظام میں لگ گئے اور جو موٹا تازہ بچھڑا انہیں میسر تھا اسی کا گوشت بھون کر مہمانوں کی خدمت میں پیش کیا۔

قرآن میں ہے:

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ

"تو جلدی سے گھر میں جا کر ایک موٹا تازہ بچھڑا (ذبح کر کے بھنوا) لائے اور مہمانوں کے سامنے پیش کیا۔"

" فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ" کا مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ چپکے سے گھر میں مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کا انتظام کرنے کے لیے چلے گئے اس لیے کہ مہمانوں کو دکھا کر اور جتا کر ان کے کھانے پینے اور خاطر تواضع کرنے کی دوڑ دھوپ ہو گی تو وہ شرم اور میزبان کی تکلیف کی وجہ سے منع کریں گے اور پسند نہ کریں گے کہ ان کی وجہ سے میزبان کسی غیر معمولی زحمت میں پڑے اور پھر میزبان کے لیے مواقع نہ ہو گا کہ وہ خاطر خواہ خاطر داری کر سکے۔

نبی ﷺ نے مہمان کی خاطر داری پر جس انداز سے ابھارا ہے اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے حضرت ابو شریحؓ فرماتے ہیں:

"میری ان دو آنکھوں نے دیکھا اور ان دو کانوں نے سنا جب کہ نبی ﷺ یہ ہدایت دے رہے تھے۔ جو لوگ خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، انہیں اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنی چاہیے مہمان کے انعام کا موقع پہلا شب و روز ہے۔" (بخاری، مسلم)

پہلے شب و روز کی میزبانی کو انعام سے تعبیر کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح انعام دینے والا دل کی انتہائی خوشی اور محبت کے گہرے جذبات کے ساتھ انعام دیتے ہوئے روحانی سرور محسوس کرتا ہے، ٹھیک یہی کیفیت پہلے شب و روز مین میزبان کی ہونی چاہیے اور جس طرح انعام لینے والا مسرت و شادمانی کے جذبات سے سرشار انعام دینے والے کے احساسات کی قدر کرتے ہوئے اپنا حق سمجھ کو انعام

وصول کرتا ہے، ٹھیک اسی کیفیت کا مظاہرہ پہلے شب وروز میں مہمان کو بھی کرنا چاہیے اور بغیر کسی جھجک کے اپنا حق سمجھتے ہوئے خوشی اور قربت کے جذبات کے ساتھ میز بان کی پیش کش قبول کرنی چاہیے۔

۴۔ مہمان کے آتے ہی اس کی انسانی ضرورتوں کا احساس کیجیے۔ رفع حاجت کے لیے پوچھیے۔ منہ ہاتھ دھونے کا انتظام کیجیے، ضرورت ہو تو غسل کا انتظام بھی کیجیے، کھانے پینے کا وقت نہ ہو جب بھی معلوم کیجیے اور اس خوش اسلوبی سے کہ مہمان تکلف میں انکار نہ کرے کمرے میں لیٹنے بیٹھنے کا جو نظم ہو وہ مہمان کو بتا دیجیے۔

۵۔ ہر وقت مہمان کے پاس دھرنا مارے بیٹھے نہ رہیے اور اسی طرح رات گئے تک مہمان کو پریشان نہ کیجیے، تا کہ مہمان کو آرام کرنے کا موقع ملے اور وہ پریشانی محسوس نہ کرے۔ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جب مہمان آئے تو ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لیے مہمانوں سے کچھ دیر کے لیے الگ ہو گئے۔

۶۔ مہمانوں کے کھانے پینے پر مسرت محسوس کیجیے، تنگ دلی، کڑھن اور کوفت محسوس نہ کیجیے۔ مہمان زحمت نہیں بلکہ رحمت اور خیر و برکت کا ذریعہ ہوتا ہے اور خدا جس کو آپ کے یہاں بھیجتا ہے اس کا رزق بھی اتار دیتا ہے، وہ آپ کے دستر خوان پر آپ کی قسمت کا نہیں کھاتا بلکہ اپنی قسمت کا کھاتا ہے اور آپ کے اعزاز و اکرام میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

۷۔ مہمان کی عزت و آبرو کا بھی لحاظ رکھیے اور اس کی عزت و آبرو کو اپنی عزت و آبرو سمجھیے۔ آپ کے مہمان کی عزت پر کوئی حمہ کرے تو اس کو اپنی غیرت و حمیت کے خلاف چیلنج سمجھیے۔

قرآن میں ہے کہ جب حضرت لوطؑ کے مہمانوں پر بستی کے لوگ بدنیتی کے ساتھ حملہ آور ہوئے تو وہ مدافعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: "یہ لوگ میرے مہمان ہیں ان کے ساتھ بدسلوکی کر کے مجھے رسوا نہ کرو، ان کی رسوائی میری رسوائی ہے۔"

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾

"لوطؑ نے کہا: "بھائیو! یہ میرے مہمان ہیں مجھے رسوا نہ کرو۔ خدا سے ڈرو اور میری بے عزتی سے باز رہو۔"

۸۔ تین دن تک انتہائی شوق و ولولے کے ساتھ میز بانی کے تقاضے پورے کیجیے۔ تین دن کی ضیافت مہمان کا حق ہے اور حق ادا کرنے میں مومن کو انتہائی فراخ دل ہونا چاہیے۔ پہلا دن خصوصی خاطر مدارت کا ہے اس لیے پہلے روز مہمان نوازی کا پورا پورا اہتمام کیجیے...... بعد کے دو دنوں میں اگر وہ غیر معمولی اہتمام نہ رہ سکے تو کوئی مضائقہ نہیں، نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

والضیافۃ ثلاثۃ ایام فما بعد ذالک فھو لہ صدقۃ (بخاری، مسلم)

"اور مہمان نوازی تین دن تک ہے اس کے بعد میز بان جو کچھ کرے گا وہ اس کے لیے صدقہ ہو گا۔"

۹۔ مہمان کی خدمت کو اپنا اخلاقی فرض کیجیے اور مہمان کو ملازموں یا بچوں کے حوالے کرنے کے بجائے خود اس کی خدمت اور آرام کے لیے کمر بستہ رہیے۔ نبی ﷺ معزز مہمانوں کی مہمان نوازی خود فرماتے تھے حضرت امام شافعیؒ جب امام مالکؒ کے ہاں جا کر بطور مہمان ٹھہرے تو امام مالکؒ نے نہایت عزت و احترام سے انہیں ایک کمرے میں سلا دیا۔ سحر کے وقت امام شافعیؒ نے سنا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور بڑی ہی شفقت سے آواز دی: "آپ پر خدا کی رحمت ہو نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" امام شافعیؒ فوراً اٹھے کیا دیکھتے ہیں کہ امام مالک ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا لیے کھڑے ہیں امام شافعیؒ کو کچھ شرم سی محسوس ہوئی۔ امام مالکؒ تاڑ گئے اور نہایت محبت کے ساتھ بولے: "بھائی! تم کوئی خیال نہ کرو۔ مہمان کی خدمت تو کرنا ہی چاہیے۔"

۱۰۔ مہمان کو ٹھہرانے کے بعد، بیت الخلاء بتادیجیے۔ پانی کا لوٹا دے دیجیے، قبلے کا رخ بتادیجیے، نماز کی جگہ اور مصلے وغیرہ مہیا کر دیجیے۔ امام شافعیؒ کو امام مالکؒ کے خادم نے ایک کمرے میں ٹھہرانے کے بعد کہا: "حضرت قبلہ کا رخ یہ ہے، پانی کا برتن یہاں رکھا ہے، بیت الخلاء اس طرف ہے۔"

۱۱۔ کھانے کے لیے جب ہاتھ دھلائیں تو پہلے خود ہاتھ دھو کر دستر خوان پر پہنچیے اور پھر مہمان کے ہاتھ دھلوائے، امام مالکؒ نے جب یہی عمل کیا، تو امام شافعیؒ نے اس کی وجہ پوچھی، تو فرمایا: "کھانے سے پہلے میزبان کو پہلے ہاتھ دھونا چاہیے اور دستر خوان پر پہنچ کر مہمان کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اور کھانے کے بعد مہمانوں کے ہاتھ دھلوانے چاہئیں اور سب کے بعد میزبان کو ہاتھ دھونے چاہئیں ہو سکتا ہے کہ اٹھتے اٹھتے کوئی اور پہنچے۔

۱۲۔ دستر خوان پر خورد و نوش کا سامان اور برتن وغیرہ مہمان کی تعداد سے کچھ زیادہ رکھیے ہو سکتا ہے کہ کھانے کے دوران کوئی اور صاحب آجائیں اور پھر ان کے لیے انتظام کرنے کو دوڑنا بھاگنا پڑے اور اگر برتن اور سامان پہلے سے موجود ہو گا تو آنے والا بھی سبکی کے بجائے مسرت اور عزت افزائی محسوس کرے گا۔

۱۳۔ مہمان کے لیے ایثار سے کام لیجیے۔ خود تکلیف اٹھا کر اس کو آرام پہنچایئے۔

ایک مرتبہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور بولا حضور ﷺ! میں بھوک سے بے تاب ہوں، آپ ﷺ نے اپنی کسی بیوی کے یہاں کہلایا، کھانے کے لیے جو کچھ موجود ہے بھیج دو۔ جواب آیا، اس خدا کی قسم جس نے آپ ﷺ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے یہاں تو پانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے پھر آپ ﷺ نے دوسری بیوی یہاں کہلا بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ایک ایک کر کے سب بیویوں کے یہاں کہلوایا اور سب کے یہاں سے اسی طرح کا جواب آیا۔

اب آپ ﷺ اپنے صحابیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا آج رات کے لیے کون اس مہمان کو قبول کرتا ہے۔ ایک انصاری صحابیؓ نے کہا: "یارسول اللہ ﷺ! میں قبول کرتا ہوں۔

انصاری مہمان کو اپنے گھر لے گئے اور گھر جا کر بیوی کو بتایا: "میرے ساتھ یہ رسول اللہ ﷺ کے مہمان ہیں ان کی خاطر داری کرو۔" بیوی نے کہا: "میرے پاس تو صرف بچوں کے لائق کھانا ہے۔" صحابیؓ نے کہا: "بچوں کو کسی طرح بہلا کر سلا دو اور جب مہمان کے سامنے کھانا رکھو تو کسی بہانے چراغ بجھا دینا اور کھانے پر مہمان کے ساتھ بیٹھ جانا تاکہ اس کو محسوس ہو کہ ہم بھی کھانے میں شریک ہیں۔"

اس طرح مہمان نے تو پیٹ بھر کر کھایا اور گھر والوں نے ساری رات فاقے سے گزاری۔ صبح جب یہ صحابیؓ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے دیکھتے ہی فرمایا: تم دونوں نے رات اپنے مہمان کے ساتھ جو حسن سلوک کیا وہ خدا کو بہت ہی پسند آیا۔(بخاری، مسلم)

۱۴۔ اگر آپ کے مہمان نے کبھی کسی موقع پر آپ کے ساتھ بے مروتی اور روکھے پن کا سلوک کیا ہو تب بھی آپ اس کے ساتھ نہایت فراخ دل، وسعتِ ظرف اور فیاضی کا سلوک کیجیے۔

حضرت ابوالاحوص جشمیؒ اپنے والد کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ایک بار انہوں نے نبی ﷺ سے پوچھا: "اگر کسی کے پاس میرا گزر ہو اور وہ میری ضیافت اور مہمان کا حق ادا نہ کرے اور پھر کچھ دنوں کے بعد اس کا گزر میرے پاس ہو تو کیا میں اس کی مہمانی کا حق ادا کروں؟ یا اس (بے مروتی اور بے رخی) کا بدلہ اسے چکھاؤں؟ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "نہیں بلکہ تم بہر حال اس کی مہمانی کا حق ادا کرو۔"(مشکوٰۃ)

۱۵۔ مہمان سے اپنے حق میں خیر و برکت کی دعا کے لیے درخواست کیجیے بالخصوص اگر مہمان نیک، دیندار اور صاحب فضل ہو۔ حضرت عبداللہ بن بسرؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ میرے والد کے یہاں مہمان ٹھہرے۔ ہم نے آپ ﷺ کے سامنے ہریسہ پیش کیا۔ آپ ﷺ نے تھوڑا سا تناول فرمایا پھر ہم نے کھجوریں پیش کیں، آپ ﷺ کھجوریں کھاتے تھے اور گھٹلیاں شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی میں پکڑ پکڑ کر پھینکتے جاتے تھے پھر پینے کے لیے کچھ پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے نوش فرمایا اور اپنے دائیں طرف بیٹھنے والے کے آگے بڑھا دیا جب آپ ﷺ تشریف لے جانے لگت تو والد محترم نے آپ ﷺ کی سواری کی لگام پکڑ لی اور درخواست کی کہ حضور ﷺ ہمارے لیے دعا فرمائیں......... اور نبی ﷺ نے دیا فرمائی

اللھم بارك لھم فیما رزقتھم واغفرلھم وارحمھم

"خدایا! تو نے ان کو جو رزق دیا ہے اس میں برکت فرما۔ ان کی مغفرت فرما اور ان پر رحم کر۔"

## مہمانی کے آداب

ا۔ کسی کے یہاں مہمان جائیں تو حسب حیثیت میزبان، یا میزبان کے بچوں کے لیے کچھ تحفے تحائف لیتے جائیے اور تحفے میں میزبان کے ذوق اور پسند کا لحاظ کیجیے۔ تحفوں اور ہدیوں کے تبادلے سے محبت اور تعلق کے جذبات بڑھتے ہیں اور تحفہ دینے والے کے لیے دل میں گنجائش پیدا ہوتی ہے۔